غالب کی بعض تصانیف

کالی داس گپتا رضا

انجمن ترقی اردو پاکستان

غالب

کی بعض تصانیف

کالی داس گپتا رضاؔ

انجمن ترقی اردو پاکستان
ڈی۔۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال،
کراچی۔۷۵۳۰۰

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو پاکستان: ۵۷۰

سال اشاعت: ۲۰۰۲ء

تعداد: پانچ سو

قیمت: =/۱۲۰ روپے

مطبع: احمد برادرز

ناظم آباد، کراچی

(دیگر سرکاری امداد یافتہ اداروں کی طرح
انجمن ترقی اردو پاکستان کو بھی اشاعت کتب کے لیے
اکادمی ادبیات پاکستان کے توسط سے امداد ملتی ہے)

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جمیل الدین عالی
معتمد اعزازی

حرفے چند

یہ واقعی حرفے چند ہے۔ راقم الحروف کی بیماری اور کثرت کار اور انجمن کی صد سالہ سالگرہ کا سر پر آ جانا اس اختصار کے بنیادی اسباب ہیں۔ درونِ خانہ پر راقم الحروف بھی کچھ محفوظ کرتا جاتا تھا، گپتا صاحب سے خط کتابت بھی ہوتی تھی۔ وہ سب انشاءاللہ اگلے ایڈیشن میں۔

آنجہانی کالی داس گپتا رضا نے انتقال سے قبل اپنی دو کتابیں "غالب کی بعض تصانیف" اور "غالب درونِ خانہ" جو ہندوستان میں شائع ہو چکی تھیں، اُن پر نظر ثانی اور مزید اضافے کر کے اشاعت کے لیے جناب مشفق خواجہ کو بھیجی تھیں۔ ان دونوں کتابوں میں کیے گئے گراں قدر اضافوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے جناب مشفق خواجہ نے ان دونوں کتابوں کو انجمن ترقی اردو سے شائع کیے جانے کو مناسب جانا۔ انجمن ترقی اردو پاکستان اس سے قبل کالی داس گپتا رضا کا مرتب کردہ دیوانِ غالب کامل پہلے ہی شائع کر چکی ہے۔ جس کے تین ایڈیشن اب تک شائع ہو چکے ہیں۔

"غالب کی بعض تصانیف" کا اضافہ شدہ ایڈیشن اب تک ہندوستان میں شائع نہیں ہوا۔ ان کتابوں پر اضافے اور نظر ثانی خود آنجہانی کالی داس گپتا رضا نے کی ہے جو پہلی بار انجمن ترقی اردو کے صد سالہ جشن کے موقع پر شائع کی جا رہی ہے۔

غالب کی زندگی میں مطبوعاتِ غالب

غالب کی تصانیف نظم ونثر میں، اگر ان مخطوطات کو بھی شامل کرلیا جائے جو ان کی زندگی میں لکھے گئے تو یقین ہے کہ تصانیف قلمی و مطبوعہ کی تعداد چار درجن سے تجاوز کر جائے گی مگر مخطوطات کی تعداد میں وقفے وقفے پر اضافہ ہوتا رہتا ہے اس لیے یہاں قاری کی عام معلومات کے لیے صرف ان تصانیف کی فہرست دی جاتی ہے جو غالب کی زندگی میں چھپ کر شائع ہوئیں۔ میں نے سال طباعت کی رعایت کو برقرار رکھتے ہوئے ایک تصنیف کے مختلف ایڈیشنوں کو بھی جداگانہ تصنیف قرار دیا ہے جن مطبوعات کی نشان وہی ○ اس طرح کی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب میرے کتب خانے میں موجود ہے گویا اس وقت ۳۳ میں سے ۲۵ مطبوعات میرے یہاں موجود ہیں:

نمبر	نام کتاب	ایڈیشن	تاریخ یا سال اشاعت		کیفیت
۱	دیوان اردو	پہلا ایڈیشن	اکتوبر	۱۸۴۱ء	○
۲	دیوان فارسی غالب	پہلا ایڈیشن		۱۸۴۵ء	○
۳	دیوان اردو	دوسرا ایڈیشن	مئی	۱۸۴۷ء	○
۴	پنج آہنگ	پہلا ایڈیشن	۱۴ اگست	۱۸۴۹ء	○
۵	مثنوی بیان نموداری شان نبوت وولایت	پہلا ایڈیشن	اگست	۱۸۵۲ء	نئی دریافت
۶	پنج آہنگ	دوسرا ایڈیشن	اپریل	۱۸۵۳ء	○

۷	مہر نیم روز	پہلا ایڈیشن	۲۸ دسمبر ۱۸۵۴ء	○
۸	قادر نامہ	پہلا ایڈیشن (۱۲۷۲ھ)	۱۴ تا ۳۱ دسمبر ۱۸۵۶ء	میرے یہاں کئی ایڈیشن ہیں مگر قدیم ترین ایڈیشن ۱۸۷۱ء کا ہے۔
۹	دستنبو	پہلا ایڈیشن	نومبر ۱۸۵۸ء	○
۱۰	دیوان اردو	تیسرا ایڈیشن	۲۹ جولائی ۱۸۶۱ء	○
۱۱	قادر نامہ	دوسرا ایڈیشن	۲۶ نومبر ۱۸۶۱ء	
۱۲	قاطع برہان	طبع اوّل	۳۱ مارچ ۱۸۶۲ء	○
۱۳	دیوان اردو	چوتھا ایڈیشن	جون ۱۸۶۲ء	○
۱۴	نگارستان سخن (کلام ذوق و غالب و مومن)		۲۳ اگست ۱۸۶۲ء	○
۱۵	دیوان اردو	پانچواں ایڈیشن	(بعد از جون) ۱۸۶۳ء	○
۱۶	کلیات غالب	پہلا ایڈیشن	مئی / جون ۱۸۶۳ء	○
۱۷	قادر نامہ	تیسرا ایڈیشن	۹ جولائی ۱۸۶۳ء	
۱۸	مثنوی ابر گہربار (الگ سے)	پہلا ایڈیشن	۱۸۶۳ء	○
۱۹	لطائف غیبی	پہلا ایڈیشن	۱۳/ اکتوبر ۱۸۶۴ء	○
۲۰	سوالات عبدالکریم	پہلا ایڈیشن	۱۸۶۴ء	○
۲۱	نامۂ غالب	پہلا ایڈیشن	(قبل از ۱۳/ اگست ۱۸۶۵ء)	○
۲۲	نامۂ غالب	دوسرا ایڈیشن	اودھ اخبار ۱۰/ اکتوبر (۱۷/ اکتوبر) ۱۸۶۵ء	
۲۳	دستنبو	دوسرا ایڈیشن	۱۸۶۵ء	○

۲۴	درفش کاویانی (قاطع برہان کا	دوسرا ایڈیشن	نومبر/دسمبر ۱۸۶۵ء	○
۲۵	قطعۂ غالب (۱۸۶۷ء میں سبد چین اور ہنگامۂ دل آشوب میں بھی شائع ہوا تھا	پہلا ایڈیشن	(قبل از: ۳۱ جولائی ۱۸۶۶ء	○
۲۶	انتخاب رقعات و اشعار غالب (جزوی طور پر ڈاکٹر ضیاالدین خاں کی مرتبہ "انشائے اردو" حصہ دوم۔ مطبوعہ فیض احمدی میں شامل)	پہلا ایڈیشن	۱۸۶۶ء	غالب کی زندگی میں یہ کتاب مکمل کبھی نہیں چھپی۔ ۱۹۹۲ء میں پہلی بار میں نے اس مخطوطے کا مکمل عکس مبسوط مقدمے کے ساتھ شائع کیا تھا۔ ابھی حال ہی (۱۹۹۵ء) میں رشید حسن خاں کے مزید اضافوں کے ساتھ "انشائے غالب" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔
۲۷	دعائے صباح	پہلا ایڈیشن	(قبل از: ۲۰ نومبر ۱۸۶۷ء	○
۲۸	تیغ تیز	پہلا ایڈیشن	۱۸۶۷ء	○

۲۹	نکاتِ غالب (اردو) و رقعاتِ غالب (فارسی)	پہلا ایڈیشن	فروری	۱۸۶۷ء	
۳۰	سبد چین	پہلا ایڈیشن	اگست	۱۸۶۷ء	
۳۱	کلیاتِ نثر غالب (اس میں پنج آہنگ، مہرِ نیمروز اور دستنبو تینوں شامل ہیں)	پہلا ایڈیشن	جنوری	۱۸۶۸ء	○
۳۲	عودِ ہندی (نامۂ غالب بھی شامل ہے)	پہلا ایڈیشن	۲۷ اکتوبر	۱۸۶۸ء	○
۳۳	اردوئے معلی (یہ غالب کی وفات کے انیس دن بعد چھپی تھی اس لیے اگر کوئی اسے غالب کی زندگی میں چھپنے والی تصنیف تسلیم نہ کرے تو حق بجانب ہوگا)	پہلا ایڈیشن	۶ مارچ	۱۸۶۹ء	○

دیوانِ غالب اردو

غالب کو عمر بھر اپنی فارسی نظم و نثر پر ناز رہا۔ انھیں یقین تھا کہ انھیں فارسی زبان سے خداداد مناسبت ہے تاہم ان کی شہرت اردو نظم و نثر سے ہوئی۔ اردو نظم سے زیادہ اور اردو نثر سے، نظم کی نسبت کم۔ اردو نثر میں اپنے خطوں کے ذریعے انھوں نے ایک نیا اسلوب وضع کیا اور اردو نظم میں قصیدہ اور غزل (بلکہ صرف غزل) کے ذریعے ایسی "طرز تحریر اور روش فکر" ایجاد کی کہ آج تک اس کی تقلید ممکن نہ ہو سکی۔ اپنی باطنی کیفیت، خیال کی بلندی اور احساس کی شدت سے انھوں نے غزل کی زبان کو خصوصی تمکنت بخشی اور الفاظ و تراکیب کو ایسی وسعتیں اور گہرائیاں عطا کیں کہ ایک خاص رنگ پیدا ہو گیا ہے اور اس پر فخر بھی انھوں نے اپنے ہی رنگ میں کیا اور اسے اختیار کرنے کی چنوتی دی۔ کہتے ہیں:

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

غالب کی زندگی میں دیوان غالب (اردو) کے پانچ ایڈیشن چھپے۔ ان میں پہلا ایڈیشن اور چوتھا ایڈیشن بہت اہم ہیں۔ پہلا اس لیے کہ یہ نہایت کمیاب ہے (ظاہر ہے کہ اس میں سب ایڈیشنوں سے کم شعر ہیں) نیز یہ غالب کی مطبوعہ اردو شاعری کے سفر میں پہلا قدم ہے اور چوتھا اس لیے کہ اس میں سب ایڈیشنوں سے زیادہ شعر ہیں اور اس کی بنیاد تیسرے ایڈیشن کا وہ نسخہ ہے جو خود غالب نے اپنے قلم سے درست اور نظر ثانی کر کے اشاعت کے لیے دیا تھا۔ ذیل میں ان تمام ایڈیشنوں کی ضروری تفصیل دی گئی ہے۔ مگر ان کوائف کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جو قاری کو عام طور پر معلوم ہیں۔

۱۔ پہلا ایڈیشن (۱۸۴۱ء)

غالب، میجر جان جاکوب بہادر (جان جیکب) کو مطبع سید الاخبار کے بارے میں کچھ اطلاعات بہم پہنچاتے ہوئے ایک خط[۲] میں لکھتے ہیں:

"......دیوانِ ریختہ کہ در نا تمامی تمام است، عجب نیست کہ ہم دریں ماہ بہ تمامی وانگاہ منظر گاہ سامی رسد......"

(ترجمہ) (میرا) دیوانِ اردو بھی جو باوجود ادھورا ہونے کے، مکمل ہے، عجب نہیں اسی مہینے میں (اسی مطبع سے) تمام ہو کر آپ کی نگاہ عالی سے گزرے......

اس خط سے دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ اوّل یہ کہ دیوان چھپ رہا ہے۔ دوم یہ کہ دیوان اگرچہ ادھورا ہے تاہم مکمل ہے یعنی منتخب ہے۔

سرورق کے مطابق، بالآخر دیوان شعبان ۱۲۵۷ھ مطابق اکتوبر ۱۸۴۱ء کو چھپ گیا۔ دیوان کے ص ۱۰۴ پر ایک رباعی[۳] درج ہے:

ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم   آثار جلالی و جمالی باہم
ہوں شاد نہ کیوں اسفل و عالی باہم   ہے اب کے شبِ قدر و دوالی باہم

عرشی صاحب مرحوم اس رباعی کے پیشِ نظر لکھتے ہیں۔

"......شعبان ۱۲۵۷ھ (اکتوبر ۱۸۴۱ء) میں میرزا صاحب کا دیوان اس مطبع (سید الاخبار) میں چھپنا شروع ہوا اور ۲۷ رمضان (۱۲ نومبر) تک زیرِ طبع رہا۔ تاریخ آغاز سرورق پر مذکور ہے اور ۲۷ رمضان تک اختتام نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں یہ رباعی بھی شامل ہے۔

ہے اب کے شبِ قدر و دوالی باہم

اور از روئے حساب دوالی اور شب قدر کا اجتماع اسی تاریخ کو ہوا تھا......"

مگر یہ دونوں دلیلیں ضعیف ہیں۔ دیوان کے سرورق پر یہ کہیں نہیں لکھا گیا کہ اکتوبر ۱۸۴۱ء طباعت دیوان کی تاریخ آغاز ہے۔ اگر تاریخ آغاز کی نشان دہی منظور ہوتی تو دن کا ذکر

بھی ہونا چاہیے تھا۔ اسی طرح رباعی سے یہ کہیں ظاہر نہیں ہوتا کہ شب قدر اور دیوالی کے اجتماع کی تاریخ گزر چکی ہے۔ اس میں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ چھوٹے بڑے آپس میں اس لیے خوش (ہو کر گلے مل رہے) ہیں کہ اب شب قدر اور دیوالی بھی ایک ہی تاریخ کو باہم (بغل گیر ہونے والی) ہیں۔ رباعی یقیناً ۲۷ رمضان (۱۲ نومبر) سے پہلے کہی گئی ہوگی۔ ایسا ہونا اگر ناممکن نہیں تو دور از قیاس ضرور ہے کہ طباعت سے مہینوں پہلے مسودے کی کتابت کرائی گئی ہو اور طباعت کے دوران میں یکایک ایک رباعی کا اضافہ کر دیا گیا ہو۔ چھپے ہوئے دیوان میں یہ رباعی جس مقام پر ہے وہ ظاہر کرتا ہے کہ تمام مسودہ ایک ہی قلم سے سلسلہ وار لکھا گیا تھا۔

دیوان میں درج شعروں کی تفصیل یہ ہے۔

غزلیات کے اشعار	۹۹۸
۲ مصرعے جو غزل میں چھپنے سے رہ گئے مگر غلط نامہ میں موجود ہیں۔[۴]	۱
قصیدوں، قطعوں، رباعیوں کے اشعار	۹۷
	۱۰۹۶

ص ۵۹ پر چھپے ہوئے ۳ شعر حقیقت میں اس قطعے[۵] کے ہیں جو ص ۱۰۰ پر درج ہے اور دوبار شامل ہوگئے ہیں۔ اس طرح مجموعی تعداد اشعار ۱۰۹۳ رہ جاتی ہے۔ اب اگر معلوم ہو کہ یہ ۱۰۹۳ اشعار، کم از کم ۲۹۵۳ اشعار سے منتخب کیے گئے ہیں[۶] تو سمجھ میں آجاتا ہے کہ غالب نے اپنے "دیوانِ ریختہ" کو "درنا تمامی، تمام" کیوں کہا۔ ان کی مراد یہ ہے کہ دیوان صرف چھاپنے کی حد تک مکمل ہے حقیقت میں مکمل نہیں کیوں کہ منتخب ہے۔

غالب کے دیوانِ ریختہ کے پانچوں ایڈیشنوں میں ان کا فارسی میں لکھا ہوا دیباچہ شامل ہے مگر اس پر تاریخ تحریر درج نہیں ہے۔ دیوان غالب (نظامی بدایونی طبع ثانی)[۷] میں پہلی بار یہ تاریخ درج کی گئی ہے۔ نظامی اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"اس مرتبہ اس سے بھی زیادہ پرانی ایک قلمی نسخہ ہاتھ آیا جو اصل

دیوان سے نقل کیا گیا ہے جس کو پہلی مرتبہ غالب نے ۱۲۴۸ھ میں
مرتب کیا تھا۔ یہ نقل جو ہمیں دستیاب ہوئی ہے اسی زمانے کی لکھی
ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ایک دیباچہ بہ زبانِ فارسی مصنف نے لکھا
ہے کہ جس کو ناظرین کے مطالعے کے لیے اس دیوان کے شروع میں
بجنسہٖ درج کیا گیا ہے......"

اس ایڈیشن میں غالب کے دیباچے کا عنوان اس طرح قائم کیا ہے:

"دیباچہ جو خود مصنف نے وقت ترتیب دیوان ہذا بزبانِ فارسی لکھا۔"

آخر میں تاریخ دیباچہ[8] اس طرح درج کی ہے:

"بست و چہارم شہر ذی قعدہ ۱۲۴۸ھ"

جو مطابق ہے ۱۶ر اپریل ۱۸۳۳ء کے۔

نظامی مرحوم کو وہ دیوان جس میں یہ دیباچہ مع تاریخ تحریر درج ہے کہاں سے ملا تھا؟ اس کی وضاحت ہمیں ڈاکٹر سید عبداللطیف کی کتاب میں شائع شدہ ایک خط کے ذریعے ملتی ہے جو نظامی مرحوم نے سر اکبر حیدری کے نام ۳ دسمبر ۱۹۲۴ء کو لکھا تھا۔[9]

نظامی فرماتے ہیں:

"قلمی دیوان جو ۱۲۴۸ھ کے قریب کا لکھا ہوا مجھے ۱۹۱۸ء میں ملا تھا اور جس کا ذکر میں نے اپنے یہاں کے مطبوعہ دیوان غالب کے دوسرے ایڈیشن میں کیا ہے...... ایک مرحوم دوست (منشی احمد علی صاحب شوق) کے ذریعے سے مجھے رام پور میں دستیاب ہوا تھا......"

چند لفظی ترامیم[10] سے قطع نظر، نظامی بدایونی کا نقل کردہ دیباچہ وہی ہے جو آٹھ سال کے بعد (۱۸۴۱ء) سے شائع ہونے والے پانچوں ایڈیشنوں میں شامل ہے۔ اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ دیوانِ غالب لگ بھگ ۱۸۳۳ء کے پہلے سہ ماہے میں طباعت کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ اب ۱۶ر اپریل ۱۸۳۳ء کو اس کا دیباچہ لکھ کر اسے کاتب کے حوالے کرنا تھا مگر ایسا نہیں ہوا۔ (دیباچہ تو لکھا گیا مگر مسودہ کاتب کے حوالے نہیں کیا گیا شاید اس لیے کہ ابھی نواب

ضیاالدین احمد خاں نیر درخشاں نے اس کی تقریظ مکمل نہیں کی تھی۔ یہ تقریظ ۱۲۵۴ھ [11] (۲۸ مارچ ۱۸۳۸ء تا ۱۷ مارچ ۱۸۳۹ء) میں مکمل ہوئی۔ اس وقت اس میں غزل، قصیدہ، قطعہ، رباعی ملا کر کل اشعار "ایک ہزار و ہفتاد و اند" تھے۔ [12] یعنی ۱۰۷۰ سے کچھ اوپر (۱، ۲، ۳ سے ۹ تک کچھ بھی)۔ لیکن جب دیوان، دیباچہ و تقریظ کے ساتھ چھپنے کے لیے دیا گیا تو اس میں جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، ۱۰۹۶ شعر [13] چھپے۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۳۳ء تک دیوان کے اشعار ۱۰۷۱ تھے۔ [14] بعد میں ۲۵ اشعار کا اضافہ ہوا۔ [15]

یہ ۲۷ شعروں میں سے لیے گئے تھے۔ تقریظ مشمولہ دیوان مطبوعہ میں لفظی تغیر و تبدل بھی ہوا اور مختلف ایڈیشنوں میں سنین اور تعداد اشعار میں ترامیم [16] بھی ہوئیں۔

۱۸۳۳ء کے بعد جن ۲۵ اشعار کا اضافہ ہوا وہ یہ ہیں۔

دیوان غالب ص ۵۳ — دی سادگی سے جان پڑوں کو ہکن کے پانو [17]

۹ شعر نسخۂ بدایوں ۱۸۳۸ء

دیوان غالب ص ۵۸ — تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا

۲ شعر حاشیہ ایضاً بعد از ۱۸۳۸ء

دیوان غالب ص ۶۵ — زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب

۱ شعر گلشن بے خار، اپریل ۱۸۳۵ء

دیوان غالب ص ۸۴ — ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے

۳ شعر نسخۂ دیواں۔ حاشیہ بعد از ۱۸۳۸ء

دیوان غالب ص ۸۶	لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے	۳ شعر۔ ایضاً
دیوان غالب ص ۱۰۰	گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری	۲ شعر۔ ایضاً
دیوان غالب ص ۱۰۳	پھبتی ہے جو مجھ کو شاہ جمجاہ نے دال	۲ شعر۔ ایضاً
دیوان غالب ص ۱۰۳	ہیں شہ میں صفات ذوالجلالی باہم	۲ شعر "شب قدر و دوالی باہم"

۲۵ شعر ۱۸۳۱ء

مندرجہ بالا سے یہ نتائج بر آمد ہوئے ہیں۔

۱۔ دیوانِ غالب اولیں طباعت کے لیے لگ بھگ ۱۸۳۳ء کے پہلے سہ ماہے تک مکمل ہو چکا تھا۔

۲۔ اس میں ۱۰۷۱ اشعار تھے۔

(میرے ترتیب دیے ہوئے "دیوانِ غالب (کامل) تاریخی ترتیب سے" کے "بابِ تعارف" میں ۱۸۳۳ء تک متداول دیوان کے لیے منتخب اشعار کی تعداد ۱۰۷۳ آتی ہے۔ تاہم دیوانِ غالب پہلے ایڈیشن (۱۸۴۱ء) میں ۱۸۳۳ء تک ۱۰۷۱ اشعار ہی شامل کیے گئے تھے۔ "جمع خرچ" کی تفصیل ملاحظہ کیجیے۔

۱۸۳۳ء تک دیوان کے لیے منتخب اشعار ۱۰۷۳

متداول دیوان میں قصیدہ "ساز یک ذرہ......" کے ۲۸ شعر ہیں

مگر پہلے ایڈیشن سے ۳ شعر محذوف ہیں ۳۔

۱۰۷۰

خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی
ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

یہ شعر پہلے ایڈیشن (ص ۲۹، ۳۰) میں نہیں ۱۔

۱۰۶۹

سیاہی جیسے گر جائے دمِ تحریر کاغذ پر
مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

☆☆☆

محابا کیا ہے، میں ضامن ادھر دیکھ
شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا

یہ دو شعر بھی پہلے ایڈیشن میں نہیں۔ ۲۔

۱۰۶۷

ہو کر شہید عشق میں پائے ہزار جسم
ہر موجِ گردِ راہ مرے سر کو دوش ہے

یہ شعر پہلے ایڈیشن (ص ۴۷) میں ہے بعد میں حذف ہوا ــــــ ۱+

۱۰۶۸

قطعے کے شعر جو پہلے ایڈیشن میں ص ۵۹ اور ص ۱۰۰ پر دوبارہ ــــــ ۳+
چھپ گئے "کلکتہ کا جو ذکر......" میزان ۱۰۷۱)

۳۔ یہ اشعار ۲۹۵۴ اشعار میں سے منتخب ہوئے تھے۔ (بعد میں ۱۸۳۱ء تک کے فکر کردہ ۲۷ اشعار میں سے ۲۵ شعر مزید منتخب ہوئے۔ ان ۲۷ شعروں کے اضافے سے اس وقت تک کے کہے ہوئے اشعار کی تعداد ۲۹۸۱ ہو گئی۔)

۴۔ اس کا دیباچہ غالب نے ۱۶ اپریل ۱۸۳۳ء کو ختم کیا۔

۵۔ تقریظ نواب ضیاالدین احمد خاں نیر درخشاں نے ۲۸ مارچ ۱۸۳۸ء اور ۱۷ مارچ ۱۸۳۹ء کے درمیان کسی وقت لکھی۔ قیاس غالب یہی ہے کہ ۱۸۳۸ء ہی میں لکھی۔

۶۔ طباعت دیوان کے وقت اس میں ۲۵ اشعار کا اضافہ ہوا اور کل شعر ۱۰۹۶ ہو گئے۔ (کاتب نے ایک غزل کے دو مصرعے حذف کر دیے تھے جس کی وضاحت "غلط نامہ" میں موجود ہے۔ اس طرح اشعار جو متن میں درج ہیں، شمار میں ۱۰۹۵ ہیں مگر حقیقت میں ۱۰۹۶ ہیں۔ ۳ شعر دوبار درج ہوئے وہ کم کیے تو دیوان کا مواد ۱۰۹۳ اشعار پر مشتمل رہ گیا۔)

۷۔ دیوان اکتوبر ۱۸۴۱ء کو "دہلی میں سید محمد خاں بہادر کے چھاپہ خانہ" (مطبع سید الاخبار) میں چھپا۔

دیوانِ غالب (طبع اوّل) بہت کمیاب ہے۔ جناب مالک رام فرماتے ہیں۔[18]

"ایک کرم خوردہ نسخہ منشی مہیش پرشاد مرحوم کے پاس تھا۔ خدا معلوم اب کہاں ہے۔ خان بہادر سید ابو محمد مرحوم کا نسخہ آزاد لائبریری، علی گڑھ میں آگیا ہے۔ ایک مکمل نسخہ صولت پبلک لائبریری، رام پور میں اور دوسرا جامعہ ملیہ اسلامیہ (دلی) کے کتب خانے میں ہے۔"

جناب عرشی مرحوم، صولت پبلک لائبریری، رام پور کے نسخے کے بارے میں لکھتے

ہیں۔[19]

"سرورق کی پہلی سطر کے آخر میں لفظ تخلص کے اوپر سید محمد خاں کے دستخط ہیں۔"

میرے کتب خانے میں اس ایڈیشن کے دو نسخے ہیں اور صولت پبلک لائبریری، رام پور والے نسخے کا عکس بھی ہے۔ جب تک میں نے عرشی صاحب کا بیان نہیں پڑھا تھا اور صولت پبلک لائبریری والے نسخے کا عکس نہیں دیکھا تھا، مجھے معلوم نہ تھا کہ سرورق کے لفظ تخلص پر بے معنی سا نشان حقیقت میں سید محمد خاں کے دستخط ہیں۔ بہر حال مجھے یہ بتاتے ہوئے تعجب ہوتا ہے کہ میرے دو نسخوں میں سے ایک پر یہی دستخط بعینہٖ اسی جگہ موجود ہیں۔ معلوم ہوتا ہے سید محمد خاں نے اس دیوان کے بعض مطبوعہ نسخوں پر دستخط کیے تھے سب پر نہیں۔

دیوان ۱۰۹ صفحوں کو محیط ہے۔ پہلا صفحہ سرورق کا ہے۔ دوسرا صفحہ خالی ہے۔ صفحات میں ۹۲ کا عدد دو دفعہ آگیا ہے مگر ص ۱۰۳ کے بعد ص ۱۰۴ چھوٹ گیا ہے، اس طرح پلڑے برابر ہو گئے ہیں۔

یہ ایڈیشن نہایت کمیاب تھا اس لیے ۱۹۸۶ء میں، میں نے اس کا عکسی ایڈیشن شائع کر کے اسے عام کر دیا ہے۔[20]

۲۔ دوسرا ایڈیشن (۱۸۴۷ء)

جناب عرشی مرحوم دیوانِ غالب اردو (پہلی بار۔ ۱۹۵۸ء ص ۹۷ دیباچہ) میں دوسرے ایڈیشن کے بارے میں لکھتے ہیں:

"نیر کی تقریظ میں تاریخ ۱۲۵۷ھ ہی ہے مگر اشعار کی تعداد، یک ہزار و یک صد و اند، بنادی گئی ہے گویا چھ برس کے اندر میرزا صاحب نے اردو کے کل چودہ شعر کہے تھے جو اس نسخے میں بڑھا دیے گئے۔ دونوں ایڈیشنوں (پہلے اور دوسرے) کے مقابلے سے معلوم ہوتا ہے کہ

صرف نواب تجمل حسین خاں کی مدحیہ غزل کا اضافہ ہوا ہے جس کے ۱۴ شعر ہیں۔"

اس سے پہلے ص ۹۶ پر عرشی صاحب کہہ چکے تھے کہ پہلے ایڈیشن میں کل ۱۰۹۸ یا (۳ شعر جو دوبار چھپ گئے ہیں کم کرکے) ۱۰۹۵ شعر ہیں۔ اس طرح دوسرے ایڈیشن میں (۱۰۹۸+۱۴) ۱۱۱۲ یا (۱۰۹۵+۱۴) ۱۱۰۹ شعر ہوئے۔

پھر اسی دیوان کی اشاعت دوم (۱۹۸۲ء۔ ص ۱۳۲ مقدمہ) میں وہی بات دہراتے ہیں، صرف یہ ترمیم کرتے ہیں کہ "چودہ شعر" کی جگہ "سولہ شعر" بتادیتے ہیں۔ جس کا سبب جینی روئی والا دو شعر کا قطعہ ہے جو پہلے ان سے گنتی میں چھوٹ گیا تھا۔ پہلے ایڈیشن کے اشعار کے شمار میں جو سہو ہو گیا تھا وہ بھی دیباچے کے ص ۱۳۱ پر درست کرلیا گیا ہے۔ اب شعر ۱۰۹۶ یا (۳ شعر کم کرکے) ۱۰۹۳ دیے گئے ہیں۔ جو قطعی درست ہے۔ مگر عرشی صاحب کی اس ترمیم کے باوجود دوسرے ایڈیشن میں اب بھی تعداد اشعار وہی رہی یعنی (۱۰۹۶+۱۶) ۱۱۱۲ یا (۱۰۹۳+۱۶) ۱۱۰۹ شعر۔

جناب مالک رام بھی دیوان غالب (تاریخ اشاعت فروری ۱۹۶۹ء) کے ص ۷ پر "تعارف" میں دوسرے ایڈیشن کی تعداد اشعار ۱۱۱۱ بتاتے ہیں۔ پھر دیوان غالب صدی ایڈیشن (جو ظاہر ہے ۱۹۶۹ء ہی کی تالیف ہے) کے ص ۱۹ پر رقم طراز ہیں:

> "اس نسخے میں (۱۱۱۱) شعر ہیں، یعنی طبع اول سے ۱۶ ازیادہ: ایک تو وہی جینی روئی والا دو شعروں کا قطعہ ہے۔ دوسری "جاں کے لیے" کی زمین کی آخری غزل، جس میں نواب تجمل حسین خاں کی مدح کا قطعہ ملتا ہے۔ اس میں چودہ شعر ہیں۔"

اس سے پہلے ص ۱۶ پر جناب مالک رام بھی پہلے ایڈیشن میں (۱۰۹۸۔۳) ۱۰۹۵ شعر ہی بتاتے ہیں۔ اس طرح اس تعداد میں ۱۶ اشعار کا اضافہ کرکے میزان (۱۱۱۱) ہو جاتی ہے۔ ۱۹۸۵ء میں بھی جناب مالک رام "گفتار غالب" (ص ۱۶۷ اور ص ۱۶۹) میں یہی بات دہراتے ہیں۔

عرشی صاحب نے دیوان غالب کی دونوں اشاعتوں میں دعویٰ کیا ہے کہ وہ

دیوانِ غالب کے ۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۷ء کے ایڈیشنوں کے مقابلے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دوسرے ایڈیشن (۱۸۴۷ء) کی تعداد اشعار ۱۱۱۲ یا ۱۱۰۹ ہے۔ یعنی پہلے ایڈیشن کے تمام کے تمام ۱۰۹۶ یا ۱۰۹۳ اشعار اور ۱۶ مزید اشعار مل کر دوسرے ایڈیشن کا کل اثاثہ بنتے ہیں۔ وہ حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ "چھ برس کے اندر میرزا صاحب نے اردو کے کل سولہ شعر کہے تھے۔"

عرشی صاحب معتبر ترین محققوں میں شمار کیے جاتے ہیں اس لیے جناب مالک رام نے عرشی صاحب کے دعوے کو من و عن تسلیم کر لیا مگر حیرت اس بات پر ہے کہ عرشی صاحب دونوں ایڈیشنوں کا مقابلہ کرنے میں اتنی بڑی چوک کیوں کر گئے۔

اب حقیقت حال ملاحظہ فرمائیے۔

پہلے ایڈیشن کے کل شعر	۱۰۹۶
کلکتہ کا جو ذکر...... والے قطعے کے شعر جو سہواً دوبار چھپ گئے	۳-
	۱۰۹۳

یہ ۲ شعر پہلے ایڈیشن میں ہیں مگر دوسرے میں نہیں:

دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے روکشی
حال آنکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں
(ص ۳۹)

بے چارہ کتنی دور سے آیا ہے شیخ جی
کعبے میں کیوں دبائیں نہ ہم برہمن کے پانو
(۵۳) ۲-

۱۰۹۱

گویا دوسرے ایڈیشن میں پہلے ایڈیشن کے ۱۰۹۶ نہیں بلکہ ۱۰۹۱ اشعار ضم ہوئے۔ اب دیکھنا چاہیے کہ دوسرے ایڈیشن میں نئے شعر کتنے لیے گئے۔

قطعہ۔ نہ پوچھ اس کی حقیقت...... بیسن کی روغنی روٹی	۲
غزل۔ نوید امن ہے بیداد دوست، جاں کے لیے	۱۴

غزل۔ کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں ۹

غزل۔ ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں ۱۲

غزل۔ ملتی ہے خوے یار سے نار التہاب میں ۱۳

غزل۔ کل کے لیے کر آج نہ خِسّت شراب میں ۱۱

پہلا ایڈیشن ص ۲۵۔ غزل ایک شعر کا اضافہ ہوا: ۱

محابا کیا ہے، میں ضامن، اِدھر دیکھ
شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا!

پہلا ایڈیشن ص ۲۹۔ غزل میں ایک شعر کا اضافہ: ۱

خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی
ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

یہ شعر دیوان میں بڑھایا گیا: ۱

سیاہی جیسے گر جائے دمِ تحریر کاغذ پر
مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

(دوسری ایڈیشن میں سہواً ہجراں کی جگہ بیجاں چھپ گیا ہے)

پہلا ایڈیشن ص ۹۵۔ "منتخب قصیدہ منقبت علی مرتضیٰ علیہ السلام"
اس سے ۳ شعر حذف کر دیے گئے تھے اب وہ دوسرے ایڈیشن میں
بحال کر دیے گئے ہیں۔ محذوف اشعار کے شروع کے لفظ یہ ہیں۔

۱۔ وہ شہنشاہ۔ ۲۔ فلک العرش۔ ۳۔ سبزۂ نہ چمن ۳

میزان اشعار تو جو داخلِ دیوان ہوئے ۶۷

میزان اشعار (پہلا ایڈیشن) ۱۰۹۱

دیوانِ غالب (دوسرا ایڈیشن) کے کل اشعار ۱۱۵۸

کل صفحات ۹۸ ہیں۔ دیوان "بہ تصحیح و مقابلہ جناب صدر المدح (یعنی مرزا اسد اللہ خاں بہادر المتخلص بغالب و اسد) در مطبع دار السلام واقع محلہ حوض قاضی مبینہ اقل العباد عنایت حسین در ماہ مئی ۱۸۴۷ء باہتمام نور الدین لکھنوی "طبع ہوا۔

مطبع دار السلام کو مطبع صادق الاخبار بھی یہ کہتے تھے کیوں کہ اس نام کا ایک اخبار اس میں چھپتا تھا۔ اسی مطبع سے ۱۸۴۵ء میں مرزا کا دیوانِ فارسی کا پہلا ایڈیشن چھپ کر شائع ہو چکا تھا۔

۳۔ تیسرا ایڈیشن (۱۸۶۱ء)

دیوانِ غالب کا یہ ایڈیشن ۲۰ محرم ۱۲۷۸ھ (۲۹ جولائی ۱۸۶۱ء) کو "مطبع احمدی میں واقع لبِ ای امو جان کے اہتمام سے ...... مطبوع ہوا" یہ دیوان بہت غلط چھپا۔ چنانچہ غالب اپنے خط مورخہ ۱۸ را گست ۱۸۶۱ء بنام میر مہدی مجروح لکھتے ہیں:

> "دیوانِ اردو چھپ چکا۔ ہائے! لکھنؤ کے چھاپے خانے، نے جس کا دیوان چھاپا، اس کو آسمان پر چڑھا دیا...... دلی پر اور اس کے پانی پر اور اس کے چھاپے پر لعنت! صاحبِ دیوان کو اس طرح یاد کرتا جیسے کوئی کتے کو آواز دے۔ بہر حال نہ میں خوش ہوا ہوں، نہ تم خوش ہو گے...... مطبع احمدی کے مالک محمد حسین خاں، مہتمم مرزا امو جان، مطبع شاہدرے میں، محمد حسین خاں، دلی شہر، راے مان کے کوچے میں، مصوروں کی حویلی کے پاس، قیمت کتاب ۶ آنے، محصول ڈاک خریدار کے ذمے......"

اس ایڈیشن میں ۱۷۹۶ اشعر ہیں، گویا ۱۸۴۸ء تا ۱۸۶۱ء غالب نے ۶۳۸ اشعار مزید منتخب کر کے اس میں شامل کیے۔ یہ وقفہ ۱۳ سال کا ہوا، مگر حقیقت اس کے برعکس ہے کیوں کہ یہ تمام (۶۳۸) اشعار ان اشعار میں سے منتخب ہوئے ہیں جو ۱۸۴۷ء کے بعد اور ۱۸۵۵ء کے درمیانی عرصے یعنی ۸ سال میں کہے گئے۔ اس کی تفصیل میرے مرتب کیے ہوئے "دیوانِ غالب (کامل) تاریخی ترتیب سے" میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

۴۔ چوتھا ایڈیشن (۱۸۶۲ء)

غالب، تیسرے ایڈیشن سے غیر مطمئن تو تھے ہی چنانچہ انھوں نے اس ایڈیشن کے

ایک نسخے کو اپنے ہاتھ سے "دو رات دن کی محنت میں" صحیح کیا۔[۲۱] اور محمد حسین خاں مالک مطبع احمد دہلی کے سپرد کیا تا کہ وہ اب ایک طرح کے اس نئے مسودے کو، کیوں کہ اس میں ۶ شعر کا اضافہ بھی کر دیا تھا، کسی دوسرے چھاپے خانے سے طبع کرا دیں۔ چنانچہ چوتھے ایڈیشن کے ص ۱۰۴ پر "خاتمۃ الطبع" کے عنوان سے یہ تحریر درج ہے۔

> "بخدمت ارباب سخن عرض کرتا ہے...... محمد عبدالرحمٰن بن حاجی محمد روشن خاں...... کہ اس سے پہلے دیوان...... جناب نواب اسداللہ خاں غالب کا دہلی میں چھپا، لیکن بسبب سہو ونسیان کے بعض مقام میں تغیر و تبدل ہوا...... اس لیے جناب...... محمد حسین خاں صاحب دہلوی نے، بعد نظر ثانی اور تصحیح جناب مصنف کی، ایک نسخہ میرے پاس بھیجا...... میں نے...... مطابق اس نسخے کے شہر ذی حجہ[۲۲] ۱۲۷۸ھ (جون ۱۸۶۲ء) مطبع نظامی واقع شہر کانپور میں صحت تمام اور درستی کمال سے چھاپا......"

مگر باوجود حزم واحتیاط کے دعوے کے کتاب میں متعدد غلطیاں راہ پا گئیں جن سے کئی مقامات پر املا اور مطلب میں الجھاؤ پیدا ہو گیا۔ جس سے ظاہر ہے کہ پروف اور کاپیاں ٹھیک سے نہیں دیکھی گئی تھیں۔ جیسے:

خوناب کو ہر جگہ خونناب لکھا گیا ہے (ص ۷، ۱۱، ۲۰ وغیرہ)

ننگ سجدے بجائے ننگِ سجدہ (ص ۱۸)

پہلو اندیشہ۔ اصل پہلوے اندیشہ (ص ۸)

حق ناسپاس بجائے حق ناشناس (ص ۳۶)

پھر بھر رہا ہے۔ بھر رہا ہوں ہونا چاہیے (ص ۸۲)

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری خوشامد سے۔ مری جو شامت آئے کی جگہ (ص ۸۳)

بھر کے بھیجیں ہیں۔ بھیجے ہیں کی جگہ (ص ۹۳)

میرے ایہام بجائے ابہام (ص ۹۵)

قاصر ہے شکایت میں۔ ستائش کی جگہ (ص ۹۸)

اس ایڈیشن میں وہ تمام (۱۷۹۶) شعر لیے گئے جو تیسرے ایڈیشن میں شامل تھے۔ ان کے علاوہ ۶ شعروں کا اضافہ بھی کر دیا۔ ۳ شعر ص ۷۷ پر درج ہیں:

بہت سہی غم گیتی شراب کم کیا ہے

جو ۱۸۵۸ء میں کہے گئے تھے اور ۷ اشعار کی ایک غزل سے انتخاب کیے گئے تھے اور ۳ شعر ص ۷۲ پر ہیں:

کیوں کر اس بُت سے رکھوں جان عزیز

جو ۱۸۶۲ء میں کہے گئے تھے۔ ان میں مطلع اور مقطع دونوں موجود ہیں معلوم ہوتا ہے کہ دیوان کے اس ایڈیشن کی اشاعت تک اس غزل کے یہی ۳ شعر تخلیق ہوئے ہوں گے۔ اس طرح اس ایڈیشن کے کل اشعار ۱۸۰۲ ہو گئے اور غالب کا یہی کلام، کلام متداول ہے اور آگے چل کر بطور متن اسی متداول کلام یعنی چوتھے (نظامی) ایڈیشن کا عکس پیش کیا گیا ہے۔

۵۔ پانچواں ایڈیشن (۱۸۶۳ء)

یہ ایڈیشن محض سال اشاعت (۱۸۶۳ء) کی وجہ سے پانچواں ایڈیشن ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اسے تیسرا یا چوتھا ایڈیشن کہنا چاہیے۔ کیوں کہ اس کا مسودہ غالب نے ۲۵ جون ۱۸۶۰ء کو شیونراین کو بھیج دیا تھا اور تیسرے ایڈیشن (جولائی ۱۸۶۱ء) کے بعد اور (قیاس ہے کہ) دسمبر ۱۸۶۱ء تک، یہ چھپنا بھی شروع ہو چکا تھا جس کا ثبوت وہ خط ہے جو غالب نے شیونراین آرام کو ۱۰ جنوری ۱۸۶۲ء کو معذرت نامے کے طور پر بھیجا تھا۔ اب جب کہ دیوان غالب کے پے در پے دو ایڈیشن (۱۸۶۱ء اور ۱۸۶۲ء) شائع ہو چکے تھے، منشی شیونراین (آرام تلمیذ غالب) کے لیے سوائے اس کے کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ اس دیوان کی اشاعت کو چندے اور روک لیتے۔ آخر کار یہ ایڈیشن ۱۸۶۳ء میں چھپا۔ سرورق کی عبارت یہ ہے:

"العلم قوۃ

دیوان غالب ۱۸۶۳ء

مطبع مفید خلائق آگرہ میں اہتمام سے منشی شیونراین کے چھپا"

اس میں ۱۷۹۵ شعر ہیں یعنی تیسرے ایڈیشن سے ایک شعر کم۔ وہ شعر یہ ہے۔

مقطع سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزم سیر نجف و طوف حرم ہے ہم کو

اس ایڈیشن کو اعلیٰ طباعت اور جدید املا کے التزام کے سبب باقی سب ایڈیشنوں پر برتری حاصل ہے۔

☆☆☆

غالب کے متداول اردو کلام میں ۱۷۹۶ اشعر وہ ہیں جو انھوں نے ۱۸۵۵ء تک کے کہے ہوئے اشعار سے منتخب کیے تھے۔ اس کے بعد دم آخر تک، انھوں نے مزید ۴۰۳ اشعار تخلیق کیے۔[۲۳] ان میں سے ۶ شعر وہ جو ۱۸۶۲ء میں چھپے ہوئے دیوانِ غالب (چوتھا ایڈیشن۔ نظامی، کانپور) میں شامل کیے گئے اور ۱۳۳ شعر قادر نامے کے اور منہا کر دیجیے جو ۱۸۵۶ء میں مطبع سلطانی دہلی سے چھپا تھا۔ اس طرح باقی ۲۶۴ اشعار بچے جو غیر مطبوعہ رہے ان کی تفصیل یہ ہے۔

۱۱ قطعے	۲۶ شعر
۴ قصیدے	۱۱۰
۵ غزلیں	۵۳
متفرق/غزلیات	۱۵
۳ رباعیاں	۶
مرثیہ	۹
مثنوی	۳
سہرا	۲
میزان	۲۶۴ شعر

اگر غالب چاہتے تو ۱۸۶۳ء کے بعد، اپنی آخری عمر میں ان ۲۶۴ اشعار میں سے مزید ۲۰۰ شعر منتخب کر کے، دو ہزار اشعار پر مشتمل اپنے اردو دیوان کا چھٹا (ساتواں) ایڈیشن بھی نکال سکتے تھے۔ لیکن تب دیوان اردو کے بجائے انھوں نے صرف اپنے دوسرے اردو فارسی کلام نظم و نثر کی طرف توجہ دی۔ چنانچہ مئی۔ جون ۱۸۶۳ء میں دیوانِ فارسی (کلیات نظم

فارسی) مطبع نولکشور لکھنؤ سے شائع ہوا۔ ۱۸۶۳ء میں مثنوی ابر گہر بار الگ سے اکمل المطابع دلّی سے شائع ہوئی۔ اسی سال مجلس پریس دلّی سے "قادر نامہ" دوسری بار چھپا۔ اسی سال "لطائف غیبی" ظہور میں آئی۔ ۱۸۶۵ء میں سوالات عبدالکریم، اگست ۱۸۶۵ء میں "نامہ غالب" اسی سال "دستنبو" کا دوسرا ایڈیشن مطبع لٹریری سوسائٹی روہیل کھنڈ بریلی سے اور دسمبر ۱۸۶۵ء میں "قاطع برہان" کی طبع ثانی بعنوان "درفش کاویانی" کی اشاعت ہوئی۔ تقریباً ۱۸۶۷ء میں "دعائے صباح" کا منظوم ترجمہ فارسی مطبع نولکشور، لکھنؤ سے اور فروری ۱۸۶۷ء میں نکات غالب و رقعات غالب مطبع سراجی دلّی سے اور اگست ۱۸۶۷ء میں مطبع محمدی دلّی سے "سبد چین" چھپی۔ جنوری ۱۸۶۸ء میں مطبع نولکشور لکھنؤ سے "کلیات نثر فارسی" اور ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو "عود ہندی" (مجموعۂ مکاتیب غالب) مطبع مجتبائی میرٹھ سے شائع ہوئی۔

بڑھاپا، برہان قاطع کا قضیہ، مقدمہ ازالۂ حیثیت عرفی، مالی بدحالی، جیسی جان لیوا پریشانیاں اور اس پر کلام نظم و نثر فارسی و اردو کا یہ زبردست اشاعتی پروگرام، اب یہ توقع رکھنا کہ وہ دیوان غالب اردو کا چھٹا (ساتواں؟) ایڈیشن بھی شائع کرا دیتے ایسا ہی ہے جیسا کہ یہ تمنا کرنا کہ:

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

"نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ نواب محمد اسد اللہ بیگ خاں بہادر عرف میرزا نوشہ المتخلص اسد و غالب" نے ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء روز دوشنبہ، دوپہر ڈھلے انتقال فرمایا:

"ہاتف نے کہا گنج معانی ہے تہِ خاک"

حواشی

(۱) ذوقؔ، غالبؔ اور مومنؔ کے دواوین کا ایک انتخاب "نگارستانِ سخن" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ دیوانِ غالب کی تقریباً تمام غزلیں اس میں شامل ہیں۔ غالب کا کہا ہوا سہرا پہلی مرتبہ اسی مجموعے میں چھپا۔ قصیدے اور قطعے بھی ہیں اگرچہ تمام کے تمام نہیں مگر کوئی رباعی درج نہیں کی گئی۔

غرضے کہ غالب کا پورا دیوان تو اس میں نہیں تاہم کلام کا وافر حصہ اس میں آ گیا ہے اس لیے اسے دیوانِ غالب کا چھٹا ایڈیشن (سالِ اشاعت کے رُو سے پانچواں) کہنا زیادہ غلط نہ ہوگا۔ قوی قیاس ہے کہ یہ مجموعہ ظہیر دہلوی شاگردِ ذوقؔ نے ترتیب دیا تھا۔ کتاب بہت غلط چھپی ہے۔ کل صفحات ۱۷۶ ہیں مگر اس کے ص ۱۶۴ پر "تمام شد" لکھ کر یہ عبارت درج کی گئی ہے۔

"الحمدللہ...... انتخاب دیوان ہر سہ شعرا...... ذوقؔ...... غالبؔ...... مومنؔ دریں چند اوراق حسب فرمائش لالہ جے نراین صاحب سوداگر کتب در مطبع احمدی واقع شاہدرہ دہلی بہ حسن اہتمام میرزا اسو ر جان حلیۂ انطباع پوشید۔ بتاریخ بست ہفتم صفر ۱۲۷۹ ہجری (۲۴ر اگست ۱۸۶۲ء) تمام شد"

ص ۱۷۵ پر خاتمے میں مزید اطلاع دی گئی ہے۔

"درخدمت ہمہ صاحبان عرض است کہ ۳ سہ جزو کتاب ہذا از جانب شروع در مطبع دیگر اولاً طبع شدہ بود و بعد از ۳ سہ جزو تا تمام در مطبع بندہ طبع گردید۔ فقط۔ الراقم بندہ اسو جان مہتمم مطبع احمدی۔"

اتفاق سے میرے غالب کلکشن میں یہ چھیوں ایڈیشن موجود ہیں۔

(۲) پنج آہنگ، طبع اول ۱۸۴۹ء، ص ۳۸۸

(۳) دیوان غالب نسخۂ عرشی، اشاعت دوم۔ مقدمہ ص ۱۲۷

(۴) دیوان غالب ص ۱۹۔ غزل کا پہلا مصرعہ یہ ہے "یک ذرۂ زمیں نہیں بے کار باغ کا۔"
(۵) "کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں" معلوم ہوتا ہے اس شعر کو قطعے سے الگ کر کے، باقی تین شعروں کو غالب نے عمداً غزلوں میں درج کیا تھا۔ بعد میں مکمل قطعہ بھی شامل کر لیا مگر غزلوں میں سے تین شعر خارج کرنا بھول گئے۔ بعد کے ایڈیشنوں میں یہ غلطی درست کر لی گئی ہے۔
(۶) دیکھیے میرے مرتبہ "دیوانِ غالب (کامل) تاریخی ترتیب سے" میں ۱۸۰۷ء سے ۱۸۳۳ء تک کے اشعار۔
(۷) اردو دیوانِ غالب مع شرح نظامی۔ مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۲۳ء، ص ۵۷ اور متنِ غالب سے ایک صفحہ پہلے۔
(۸) اردو دیوانِ غالب مع شرح نظامی۔ مطبوعہ نظامی پریس بدایوں۔ ۱۹۲۳ء، ص ۵۷ اور متنِ دیوانِ غالب سے ایک صفحہ پہلے۔
(۹) غالب از: ڈاکٹر سید عبداللطیف (انگریزی سے ترجمہ) مطبوعہ حیدر آباد۔ ۱۹۳۲ء، ص ۱۳۵
(۱۰) مثلاً طباعت کے وقت "در خاکستر خویش" کو "بہ خاکستر خویش"، "کم مایہ" کو "اندک مایہ" بنادیا گیا ہے۔
(۱۱) آثار الصنادید۔ مطبوعہ نولکشور جون ۱۸۷۶ء، باب چوتھا ص ۸۵ "سنہ مقدسہ ہجریہ نبویہ...... یک ہزار و دویست و پنجہ و چار...... "
(۱۲) ایضاً۔ ۸۶
(۱۳) دیوانِ غالب (پہلا ایڈیشن) تقریظ میں تعدادِ اشعار "ہزار و نود و ہشت اند" لکھا ہے، جو غلط ہے۔
(۱۴) دیکھیے میرے مرتبہ "دیوان غالب (کامل) تاریخی ترتیب سے" میں ۱۸۰۷ء سے ۱۸۳۱ء تک کے 'م' نشان والے اشعار۔
(۱۵) دیکھیے میرے مرتبہ "دیوان غالب (کامل) تاریخی ترتیب سے" میں ۱۸۰۷ء سے ۱۸۳۱ء تک کے 'م' نشان والے اشعار۔

(۱۶) ایک شعری ترمیم دلچسپ ہے۔ تقریظ میں شامل مثنوی کا تیسرا شعر آثار الصنادید میں اس طرح ہے۔
"مبیں فرزندِ آبائے علوی، ببیں شاگردِ روح القدس عالی" اس کے مصرعۂ ثانی کو دیوان غالب (پہلا ایڈیشن) میں یوں کر دیا ہے۔ "دمِ روح القدس درکشفِ معنی"، پھر بعد کے ایڈیشنوں میں یہ شکل دے دی ہے۔ "ببیں شاگردِ عقلِ کلِ عالی"

(۱۷)

بے چارہ کتنی دور سے آیا ہے شیخ جی
کعبے میں کیوں دبائیں نہ ہم برہمن کے پانو

یہ شعر بعد میں متداول دیوان غالب سے خارج کر دیا گیا تھا۔ اس طرح اب متداول دیوان میں اس غزل کے ۹ کے بجائے ۸ شعر شامل ہیں۔

(۱۸) ذکرِ غالب۔ طبع پنجم ص ۱۶۶۔

(۱۹) دیوانِ غالب نسخۂ عرشی۔ ص ۱۲۸۔ مقدمہ

(۲۰) میں نے "دیوانِ غالب (عکسی۔ مطبوعہ ۱۸۴۱ء)" یعنی دیوانِ غالب کے پہلے ایڈیشن کو شائع کرتے وقت جو پیش لفظ لکھا تھا اس کے ص (ر) پر نئی معلومات کی روشنی میں اعداد و شمار کی حد تک کچھ رد و بدل کیا ہے۔ اس لیے ان سے، جن کے پاس میرے شائع کردہ ایڈیشن کا نسخہ ہو، گزارش ہے کہ وہ اس دیباچے کے پیش نظر اپنے نسخے میں ترمیم کر لیں۔

(۲۱) یہ الگ ایک داستان ہے جو بہت جگہ دہرائی جا چکی ہے اس لیے یہاں اسے حذف کیا جاتا ہے۔

(۲۲) ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ = ۳۱ مئی تا ۲۸ جون ۱۸۶۲ء

(۲۳) تفصیل کے لیے دیکھیے میرا مرتب کیا ہوا "دیوان غالب (کامل) تاریخی ترتیب سے۔"

غالب کی متنازعہ رباعی[1] پر ایک نظر

دکھ، جی کے پسند ہو گیا ہے غالب
دل، رُک رُک کر بند ہو گیا ہے غالب
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا، سوگند ہو گیا ہے غالب

ا۔ اس رباعی کے بارے میں نظم طباطبائی لکھتے ہیں:

"...... رباعی کے دوسرے مصرع میں دو حرف وزنِ رباعی سے زائد ہو گئے ہیں اور ناموزوں ہے، مختلف چھاپے کے سب نسخوں میں بھی اور جس نسخے کی کاپیاں خود مرحوم کی تصحیح کی ہوئی ہیں، اس میں بھی یہ مصرع اسی طرح ہے...... اب خیال کرو، غالب سا موزوں طبع شخص اور ناموزوں کہہ جائے...... غرض کہ غالب سے شاعر منفرد نے عمر بھر مشق کر کے بھی ان اوزان پر قابو نہ پایا اور وزن غیر طبعی ہونے کے سبب سے دھوکا کھایا......"[2]

۲۔ مولانا امتیاز علی عرشی مرحوم اپنی ایک فروگذاشت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔[3]

"...... مرزا صاحب کی ایک رباعی...... میں سے مولانا نظم طباطبائی کے اعتراض کے تحت میں نے ایک لفظ گرا کر مصرع یوں چھاپا ہے:

دل رُک کر بند ہو گیا ہے غالب!

فاضل محترم جناب منشی حامد علی خاں صاحب منشی فاضل (رام پور) نے مجھے بتایا کہ یہاں رُک رُک، یہ تکرار درست ہے۔ کیوں کہ یہ مصرعِ رباعی کے ۲۴ وزنوں میں سے ایک وزن پر پورا اترتا ہے اور یہ بات ازروے قواعدِ عروض جائز ہے کہ رباعی کے چاروں مصرعوں کو ایک یا زائد اوزانِ رباعی پر نظم کیا جائے۔ لہٰذا اربابِ ذوق متن (دیوانِ غالب نسخۂ عرشی) میں تصحیح فرما کر شرحِ غالب (ص ۲۸۰ نظم طباطبائی) کا نوٹ کالعدم قرار دے لیں۔"

ظاہر ہے کہ دانش وروں نے عرشی صاحب کو ان کی "فروگذاشت" کا احساس دلایا ہوگا۔ چنانچہ عرشی صاحب دیوانِ غالب کی دوسری اشاعت میں اپنے پہلے بیان کو کالعدم قرار دیتے ہوئے یوں رقم طراز ہوتے ہیں:

"اس رباعی کے دوسرے مصرع میں مرزا صاحب نے ازراہِ سہو ایک رکن بڑھادیا ہے۔ ملاحظہ ہو شرح طباطبائی: ۳۶۲......"[4]

قطع نظر اس کے کہ یہاں رُکن کی جگہ سبب خفیف لکھنا زیادہ مناسب ہوتا، اس بات کی داد دینی ہوگی کہ عرشی صاحب نے یہاں بے کار کی تاویلوں میں اُلجھنے کے بجائے سیدھے سیدھے حق کا راستہ اختیار کیا۔

۳۔ رسالہ اردو ادب میں علامہ سحر عشق آبادی مرحوم کا ایک مضمون "غالب کی ایک رباعی" چھپا تھا، جو اس رباعی سے متعلق ہے۔ سحر لکھتے ہیں:[5]

"غالب کی رباعی ہر شاعر کے لیے ایک پہلی بنی ہوئی ہے جو جس کے سمجھ میں آتا ہے، لکھ دیتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مرزا نوشہ اس پر نوٹ لگانا چاہتے تھے، لیکن دوسرے مرزا (ہر گوپال سہائے صاحب مجھنا گر تفتہ سکندر آبادی) نے کہا کہ کچھ تو اوروں کو سمجھنے کے لیے چھوڑ دیجیے، کیا اتنی بات بھی اہل نظر نہ سمجھ سکیں گے؟ مرزا نوشہ مسکرا کر خاموش ہوگئے۔ آخر وہی ہوا جس کا مرزا نوشہ کو شبہ تھا......"

آگے لکھتے ہیں:

"اس میں عروض کا جو نکتہ ہے وہ طباطبائی سے پوشیدہ نہ تھا۔ اُنھوں نے عمداً اظاہر نہ فرمایا، وہ چاہتے تو اب تک یہ مصرع معمانہ بنا رہتا، آخر مجھے یہ معما حل کرنا ہے اور ضرور کروں گا۔"

لیکن اس کے بعد سحؔر صاحب اور ہی باتوں میں اُلجھ گئے۔ گویا ہماری بد قسمتی سے یہ معما حل ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اب ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ سحؔر صاحب کے ذہن میں کون سا حل موجود تھا۔ اس لیے فی الحال اس مسئلے کو نظر انداز کیے بغیر چارہ نہیں مگر سحؔر صاحب کی دو باتیں محلِ نظر ہیں۔ اوّل یہ کہ غالب اور تفتہ نے گٹھ جوڑ کرکے یہ معلوم کرنا چاہا تھا کہ دوسرے مشاہیر بلحاظ عروض کتنے پانی میں ہیں، دوم یہ کہ نظم طباطبائی جانتے تھے کہ اس غلط مصرع میں عروض کا کیا نکتہ پوشیدہ ہے اور اُنھوں نے عمداً اسے ظاہر نہیں کیا۔

جہاں تک نظم طباطبائی کا تعلق ہے، اُن کے کسی بیان سے ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ کسی طرح بھی اس رباعی (دوسرا مصرع) کو صحیح سمجھتے تھے۔ اُنھوں نے صاف لکھا ہے کہ رباعی ناموزوں ہے اور یہ کہ غالب نے دھوکا کھایا اس لیے سحؔر صاحب کا بیان مفروضے کے سوا کچھ نہیں۔

اب مختصراً یہ دیکھنا[6] ہے کہ خود غالب اور تفتہ کا عروض میں کیا مرتبہ ہے اور کیا یہ واقعی عروض کی ان بلندیوں کو چھو سکتے تھے کہ اپنے معاصرین اور آنے والی نسلوں کو اپنی عروضی کرتب بازی سے صدیوں تک حیرت میں ڈالے رکھیں، صرف ایک ہی مثال کافی ہوگی۔

غالب لکھتے ہیں:

"میں بحر ہزج مسدس۔ مجنون میں ایک شعر تم کو لکھتا ہوں......"

"بابو برج موہن، سوائے اس بحر (ہزج) کے یا بحر رمل کے اور بحر میں نہیں آسکتا۔ وہ شعر میرا یہ ہے:

برم چوں نامِ بابو برج موہن[7]
چکد خونِ دل ریش از لب من[8]

غالب نے یہ خط تفتہ کو ۳۰ر اپریل ۱۸۵۹ء کو لکھا تھا۔ اس کے جواب میں تفتہ نے

غالباً غالب کے بیان کو چیلنج کرتے ہوئے ایک دوسرے وزن میں، بابو برج موہن کو کھپادیا۔ تاہم وہ وزن غالب کی بیان کردہ بحروں سے باہر نہیں تھا۔ چنانچہ غالب ۲۴ مئی ۱۸۵۸ء کو لکھتے ہیں:

"وہ جو تم کہتے ہو کہ

حرف بابو برج موہن ہے زخم

...... جب تک کہ تم نے نہیں لکھا، میرے خیال میں بھی یہ بات نہ تھی۔ بہر حال بات وہی ہے، جو میں اوپر لکھ آیا ہوں......" [9]

حقیقت یہ ہے کہ غالب کا شعر ہزج مسدس محذوف میں ہے نہ کہ ہزج مسدس مجنون میں۔ غالب نے مجنون غلط لکھا ہے کیوں کہ ہزج میں خبن نہیں آتا۔ خبن دوسرے حرف ساکن کے گرنے کا نام ہے۔ مفاعیلن میں دوسرا حرف متحرک ہے، اس لیے خبن کی گنجائش نہیں۔ [10]

اب رہا بابو برج موہن کے بحر ہزج اور بحر رمل کے سوائے کسی اور بحر میں نہ آسکنے کا غالب کا دعویٰ، تو یہ غلط ہے۔ کیوں کہ "بابو برج موہن، ہزج اور رمل کے علاوہ بھی کئی بحروں میں آسکتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ اردو میں مصرع میں نے لگائے ہیں:

(۱) مضارع مثمن سالم　　مفاعیلن　فاعلاتن　مفاعیلن　فاعلاتن

(مصائب سے رنج و غم سے چھٹے بابو برج موہن)

(۲) سریع مسدس مکسوف　　مستفعلن　مستفعلن　مفعولن

(دنیا سے بابو برج موہن اٹھے)

(۳) خفیف مسدس سالم　　فاعلاتن　مستفع لن　فاعلاتن

(اب کہاں بابو برج موہن کا ثانی)

(۴) رجز مثمن سالم　　مستفعلن　مستفعلن　مستفعلن　مستفعلن

(افسوس بابو برج موہن آج دنیا سے گئے)

اب آپ پر ظاہر ہو گیا ہوگا کہ غالب اور تفتہ صرف اتنا ہی عروض جانتے تھے جتنا کہ اس زمانے کے عام کہنہ مشق شاعر اور ادیب۔ وہ عروض کے منتہی نہ تھے کہ کوئی ایسا کام

کر سکتے جو دنیائے ادب کو حیرت میں ڈال دیتا۔ غالب اعلیٰ درجے کا تخلیقی ذہن رکھتے تھے، اس کے مقابلے میں اُنھیں فن شعر میں پوری دسترس حاصل نہ تھی، کیوں کہ اُنھوں نے باقاعدہ اکتسابِ فن نہیں کیا تھا۔ مستعار کتابیں اور مقامی عالموں کی زبانی سنی سنائی باتوں پر تکیہ کسی کو ماہر فن نہیں بنا سکتا۔ تاہم اُنھیں شاگردوں کے استفسار پر کچھ نہ کچھ کہنا ضرور ہوتا تھا، اس لیے غلطیوں کے مرتکب ہو جایا کرتے تھے۔

(۴) جناب حامد علی "خاں تحریر فرماتے ہیں: [۱۲]

"......دل رُک کر بند ہو گیا، تو ایسا ہی مہمل ہے جیسا "دل رُک کر رُک گیا، یا دل بند ہو کر بند ہو گیا۔ [۱۳] غالب نے دل رُک رُک کر کہا تھا، تو اس طرح ایک ایسے تدریجی عمل کی طرف بلیغ اشارہ کیا تھا جو آخر کار حرکت قلب کے کاملاً بند ہو جانے کی تمہید بنا تھا اور جس کا ذکر کے بغیر مصرع قطعاً بے کیف رہ جاتا ہے۔ عروض خواہ کچھ کہے رُک کر، کو رُک رُک کر، کی جگہ نہیں دی جا سکتی......"

میں عرض کرتا ہوں کہ "دل رُک رُک کر بند ہو گیا ہے غالب، میں یقیناً ایک سبب زائد ہے اور اسلوب کلام پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے رُک کر، نہیں بلکہ رُک کر ہی کہا ہوگا۔ جیسے ان کے یہ مصرعے:

ع: میں بھی رُک رُک کے نہ مرتا، جو زباں کے بدلے

ع: تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے

اور اس طرح ان سے یقیناً عروضی سہو ہوا ہے، لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اُنھوں نے "دل رُک بند ہو گیا ہے غالب، کہا ہو، ان کے کلام میں ایسی مثالیں موجود ہیں جہاں اُنھوں نے "کر" کو محذوف رکھا ہے۔ مثلاً:

ع: ہوش اُڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ، اسدؔ

ع: رُک گیا دیکھ روانی میری

دونوں جگہ "دیکھ" بطور فعل امر نہیں، بلکہ "دیکھ کر" کے معنوں میں آیا ہے، غالب خود اس مصرع کی تشریح کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

"......وہ میری طبع کی روانی دیکھ کر رُک گیا......" ۱۴

گویا مصرع میں کر کا حذف دانستہ کیا گیا ہے۔ حامد علی خاں صاحب کا یہ کہنا کہ دل کے رُک رُک کر بند ہو جانے سے غالب کی مراد ایسے "تدریجی عمل" سے ہے "جو آخر کار حرکت قلب کے کاملاً بند ہو جانے کی" خبر دیتا ہے، غلط ہے۔ اگر اس مصرع سے یہ مطلب لیا جائے کہ ہوتے ہوتے دل کی حرکت کاملاً بند ہو گئی تو رباعی کے آخری دو مصرعے۔

واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں

سونا سوگند ہو گیا ہے غالب

قطعی بے کار ہو جاتے ہیں۔ موت کی ابدی نیند کے بعد رات کو نیند نہ آنے کی شکایت اور سونا سوگند ہو جانا، بے ربط باتیں ہیں۔ مصرع کا مطلب صرف اتنا ہے کہ بار بار کے رنج والم سے دل گھٹ کے رہ گیا ہے۔ اس مصرع میں حرکت قلب بند ہو جانے سے موت واقع ہونے کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے۔ غالب کے زمانے میں یا اس سے پہلے اس محاورے کے وہی معنی لیے جاتے تھے جو میں نے اوپر بیان کیے ہیں۔ مثلاً میر حسن:

تو رُک رُک کے دل کو نہ کر اپنے بند

نہ پہنچے کہیں تیرے جی کو گزند ۱۵

(۵) شمس الرحمن فاروقی فرماتے ہیں:

"ایک یا ایک سے زیادہ حرف مصرع کے شروع میں زائد کرنا اور اسے تقطیع میں نہ شمار کرنا بھی فارسی میں زحاف خرم کے تحت موجود ہے۔ متاخرین نے اسے ترک کیا تو کیا ہوا، کتابی جواز تو ہے ہی، کیوں کہ محقق طوسی نے بھی زحاف خرم کو منسوخ نہیں کیا" ۱۶

فاروقی صاحب نے اگرچہ واضح نہیں کیا کہ یہ بیان غالب کی رباعی کے دوسرے مصرع کی تائید میں ہے، تاہم جناب زار علامی نے یہی سمجھا ہے، وہ لکھتے ہیں: ۱۷

"شمس الرحمن فاروقی کا غالب کے مصرع کے متعلق زحاف خرم کے حق میں بولنا ہرگز ان کے دماغ کی اپج نہیں بلکہ خاتم العروض استاذی حضرت علامہ عشق آبادی آنجہانی سے سنی سنائی بات ہے......"

لیکن علامہ سحر عشق آبادی مرحوم نے بھی زحاف کہیں سے پڑھ کر ہی معلوم کیا ہوگا، کشف تو ہوا نہیں ہوگا۔ فاروقی صاحب پڑھے لکھے آدمی ہیں اور پڑھنے کا شوق رکھتے ہیں۔ کیا انھوں نے سحر مرحوم کی طرح "معیار الاشعار" (محقق طوسی) یا اس کا ترجمہ اردو وزیر کامل عیار (اسیر لکھنوی مرحوم) انھیں پڑھا ہوگا؟ مجھ ایسے کم مطالعہ شخص نے یہ کتاب اوّل سے آخر تک ایک سے زیادہ بار پڑھی ہے (زرکامل عیار (اکتوبر ۱۹۰۵ء نولکشور کانپور بار اوّل) کا ایک نسخہ میرے کتب خانے میں موجود ہے، (اقتباسات آگے آئیں گے) یہاں ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتا ہوں۔ کوئی تیس برس پہلے کی بات ہے، میں نے "فاعلاتن مفاعلن فعلن" کے وزن پر ایک قطعہ "آزمائش" کے نام سے لکھا اور ہر مصرع کے شروع میں ایک حرف بڑھا دیا یہ بات محض ایک جدت پیدا کرنے کے خیال سے ذہن میں آئی تھی، کوئی اور مقصد نہ تھا۔ قطعہ استاذی قبلہ جوش ملسیانی کو اصلاح[۱۸] کے لیے بھیجا انھوں نے بغیر اصلاح واپس کر دیا اور اس کے ساتھ حاشیے میں ایک نوٹ لگا کر ۱۲ جولائی ۱۹۵۳ء تاریخ ڈال دی، میں نوٹ بعد میں لکھوں گا، پہلے قطعہ دیکھ لیجیے:

آزمائش

جنون ہوں، جہل ہوں، میں وحشت ہوں
مگر سبق دہر کو پڑھاتا ہوں
بنی جو ہو تو بگاڑ دوں سو بار
کسی کی بگڑی نہیں بناتا ہوں
حرام کو بھی حلال سمجھا ہے
حلال کو بھی حرام پاتا ہوں
جو نالے کرتے ہیں، آہیں بھرتے ہیں
میں اُن کی صورت پہ مسکراتا ہوں
شراب پیتا ہوں توبہ کر کر کے
بدل بدل کر کباب کھاتا ہوں
نہیں ہوں پابند حکم یزدانی
نمازیوں کو بھی منہ چڑاتا ہوں
معاف گستاخیاں مری اے دوست!
صحیح، لو بات اب بتاتا ہوں
فقط خدا کے رحیم ہونے کو
گناہ کر کر کے آزماتا ہوں

نوٹ یہ ہے:

"محض ارکان جمع کر دینے کا نام وزن نہیں ہے، عروض کی پابندی شرط
ہے۔ کسی بھی وزن کے شروع میں حرف یا حروف زیادہ کرنا صدیوں
سے متروک ہے۔ ایک تو اس کا کوئی جواز نہیں، دوسرے (شعر میں)
مغایرت پیدا ہوتی ہے......."

جوش ملسیانی ۷/۵۴ ۱۴

"صدیوں سے متروک" سے مراد یقیناً محقق طوسی کا زمانہ (۱۲۰۰ء تا ۱۲۷۴ء) ہے۔ یعنی سات صدیاں بیت چکی ہیں۔ کیا جوش صاحب بھی خزم سے ناواقف تھے؟ انھوں نے دیوانِ غالب کی شرح میں اس رباعی کے دوسرے مصرع کے لیے خزم سے کوئی استفادہ نہیں کیا کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ اگر یہ زحاف منسوخ نہیں تو منسوخ کی حد تک متروک ہے۔

جناب زار علامی صاحب آگے چل کر بغیر کسی ثبوت کے تقریباً وہی قصہ دہراتے ہیں جو مختصراً سحر عشق آبادی مرحوم غالب اور تفتہ کے تعلق سے پہلے کہہ چکے تھے اور جس کے من گھڑت ہونے میں شک نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے استاد کی زبانی اتنا ضرور اضافہ کر دیا کہ:

"مرزا غالب نے یہ رباعی ہرگوپال تفتہ کے کہنے پر بطور مثال تخلیق
کی تھی اور بس...... یہاں ضرورت شعری کی بات بھی نہیں۔ غالب
اگر چاہتا تو اس رباعی کو حذف بھی کر سکتا تھا لیکن اس کا مدعا تو صرف
"خزم" کی مثال پیش کرنا تھا اور وہ بھی تفتہ کے کہنے پر۔ اب لوگ اس
کو کچھ بھی رنگ دیں...... " ۱۹

تحقیق میں کسی بات کو اپنی مرضی سے کوئی رنگ نہیں دیا جا سکتا۔ تحقیق بے رنگ ہوتی ہے یا کہیے کہ رنگِ تحقیق اس کا رنگ ہوتا ہے۔ "غالب اگر چاہتا تو اس رباعی کو حذف بھی کر سکتا تھا......" مگر وہ ایسا نہیں کر سکے کیوں کہ یہ رباعی غالب کی بہترین رباعیوں میں سے ہے اور اس کی روانی ہی کی وجہ سے غالب اور اس کے معاصرین اس کے دوسرے مصرع کی ناموزونی کو محسوس نہ کر سکے۔ غالب نے اسے محض "خزم" کی مثال پیش کرنے کے لیے تخلیق نہیں کیا تھا، کیوں کہ خزم کی مثالیں پہلے سے موجود ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ غالب، تفتہ، سحر عشق آبادی اور زار علامی، جیسے ماہرین عروض میں سے کسی نے معیار الاشعار یا

زر کامل عیار ترجمہ معیار الاشعار کی فصل ہشتم، جو تغیر زیادت کے بیان میں ہے، نہیں پڑھی، جس میں خزم کی ایک نہیں بلکہ سات مثالیں موجود ہیں اور انھوں نے شاید یہ بھی نہیں پڑھا کہ سات سو برس پہلے بھی محقق طوسی نے "خزم" کو "نہایت گراں اور ناپسندیدہ" کہا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ "متاخر البتہ استعمال خزم کا نہیں کرتے ہیں۔" اب غالب کے ایسا غیر معمولی ذہن جو شعری علوم کی چھوٹی چھوٹی پیچیدگیوں سے گھبرا کر یہ تک کہنے پر مجبور ہو جائے کہ "ائمہ فن نے وہ کچھ لکھا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا......" [۲۰] صدیوں کے پرانے عروض پر کیا حاوی ہو سکتا ہے اور صدیوں سے متروک، گراں اور ناپسندیدہ زحاف کو زندہ کرنے پر کیوں کر کمر بستہ ہو سکتا ہے۔

اب ذیل میں زر کامل عیار (اسیر لکھنوی) ترجمہ معیار الاشعار (محقق طوسی) (مطبوعۂ نولکشور کان پور...... اکتوبر ۱۹۰۵ء بار اوّل) کی فصل ہشتم (ص ۲۲۲) کے اردو متن کا ضروری حصہ درج کیا جاتا ہے:

"ص ۲۲۲...... فصل ہشتم، بیان تغیر زیادت میں کہ ارکان سے تعلق نہیں رکھتا۔ بس تغیرات جو پہلے بیان کیے ہم نے ان میں ایک تغیر بہ زیادت بھی ہے، اس کو خزم کہتے ہیں، کسی جگہ مثال اس کی نہیں لائے ہم۔ وہ نہایت گراں اور ناپسندیدہ ہے اور کسی رکن اور کسی بحر کے ساتھ خاص نہیں اور یہاں اس کو اس لیے بیان کیا ہے کہ جب تک بحریں اور اوزان معلوم نہ ہوں، ادراک اس کا جیسا چاہیے، حاصل نہیں ہوتا اور خزم اکثر بہ یک حرف ہوتا ہے کہ اوّل بیت میں لاتے ہیں۔ ...... [(حاشیہ) خزم در اصل انداختن حلقہ در بینی شتر است] ...... اور زیادہ ایک حرف سے بھی لائے ہیں، چار حرف تک یعنی چار حرف کا کلمہ اور بہت کم ہے اور مثال اس کی...... مرقوم متن ہے۔...... مثال زیادت دو حرف (ایک سبب خفیف) کی یہ ہے۔ شعر۔ قد فاتی الیوم من حدیثک مالست مدرکہ ...... بروزن فاعلاتن مفاعلن فعلاتن مفاعلن، خفیف مجزو سے اور قد خزم ہے......اور فارسی میں بہ یک

حرف قدما لائے ہیں یعنی اوّل مصرع میں......اور بعضے اوّل مصرع
دوم میں بھی لائے ہیں جیسا کہ مرادی نے کہا ہے:

[از حشم وگنج چہ فریاد وسود
کہ مرگ کند بر تن تو تاختن]

......بحر سریع ہے اور حرف کاف (کہ) کا اوّل مصرع دوم میں خزم ہے
اور متاخرالبتہ استعمال خزم کا نہیں کرتے ہیں......"

اسی فصل میں ذیل کی سات مثالوں کی نشان دہی کی جاتی ہے۔ اصل کے لیے کتاب سے رجوع کریں۔

۱	مثال	امرا القیس	ص ۲۲۱	دکان......بحر طویل
۲	مثال	(حاشیہ)	ص ۲۲۲	تاللہ......بحر بسیط
۳	مثال	(متن)	ص ۲۲۲	اُشدد......بحر ہزج
۴	مثال	(متن)	ص ۲۲۳	تدفاتی......بحر خفیف
۵	مثال	(متن)	ص ۲۲۳	لوا حذرت......بحر مدید
۶	مثال	رودکی	ص ۲۲۳	جعد ہچوں......بحر خفیف
۷	مثال	مرادی	ص ۲۲۳	از حشم وگنج......بحر سریع

استدراک

امیر لکھنوی نے اپنی کتاب شجرۃ العروض (نولکشور۔ نومبر ۱۸۷۳ء، ص ۲۲) میں بھی خزم کا ذکر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ معیار الاشعار ہی سے اخذ کیا ہے، لیکن مثالیں نہیں دیں۔ اقتباس حاضر ہے:

"خزم بالفتح وزاء معجم۔ معنی لغوی۔ حلقہ در بینی شتر وغیرہ کردن۔ معنی اصلاحی اہل عروض = یک حرف یا دو یا سہ یا چہار حرف زیادہ کردن در اوّل مصراع کہ در تقطیع شمار نکنند واین مخصوص اشعار عرب است و در فارسی ہم قدما یک حرف آوردہ اند، استعمال متاخرین نیست۔" ۲۱

حواشی

(۱) سلسلے کے لیے "غالبیات: چند عنوانات" کالی داس گپتا رضا (۱۹۸۲ء) ص ۱۵۴ ملاحظہ کیجیے۔

(۲) شرح دیوانِ غالب اردو۔ نظم و حیدر طباطبائی۔ مطبع مفید الاسلام۔ حیدر آباد مطبوعہ ۱۳۱۸ھ (۱۹۰۱۔ ۱۹۰۰ء) ص ۳۳۲

(۳) دیوانِ غالب اُردو نسخۂ عرشی: پہلی بار (۱۹۵۸ء) ص ۱۳۰

(۴) دیوانِ غالب نسخۂ عرشی، نقش ثانی (اشاعت دوم ۱۹۸۲ء) حاشیہ صفحہ ۳۴۰

(۵) اُردو ادب (شمارہ ۳۔ ۱۹۶۵ء) بحوالہ غالبیات: چند عنوانات ص ۱۵۶

(۶) جہاں تک غالب اور تفتہ سے منسوب بیانات ہیں۔ ان کی حیثیت افسانہ طرازی سے زیادہ نہیں۔

(۷) خیال رہے کہ غالب اور تفتہ نے بابو کو بروزن فعلن، برج کو بروزن فاع اور موہن کو بروزن فعلن رکھا ہے۔ اس لیے میں نے بھی انھیں وزنوں کو پیش نظر رکھا ہے۔

(۸) اُردوئے معلّی ۱۸۶۹ء، ص ۵۶

(۹) اُردوئے معلّی ۱۸۶۹ء، ص ۱۶۰

(۱۰) پوری بحث کے لیے دیکھیے۔ غالبیات چند عنوانات۔ ص ۱۶۰

(۱۱) دیوانِ غالب مرتبہ حامد علی خاں، مجلس یادگار غالب لاہور۔ ۱۹۶۹ء، ص ۲۲۸ حاشیہ

(۱۲) غالبیات چند عنوانات۔ ص ۱۵۴ بھی ملاحظہ کیجیے۔

(۱۳) ڈاکٹر گیان چند نے "غالبیات چند عنوانات" میں اس رباعی پر میری توضیح پڑھ کر مجھے لکھا۔ "میں نے بھی رموزِ غالب میں ص ۵۷ پر (حامد علی خاں کی طرح) یہی بات لکھی ہے کہ "دل رُک رُک کر بند ہو گیا ہے، وہی بات ہوئی جیسے دل بند ہو کر بند ہو گیا ہے۔ میری یہ تحریر نقوش کے غالب نمبر ۱۹۶۹ء میں چھپی تھی۔ کیا حامد علی خاں نے اسے دیکھنے کے بعد اپنا دیوان شائع کیا؟ بہر حال آپ کا نوٹ پڑھ کر پہلی بار اس مصرع کے

معنی سمجھ میں آئے......"

(۱۴) ادبی خطوطِ غالب۔ انوار المطابع لکھنؤ۔ ۱۹۳۸ء ص ۱۳۳ خط بنام مولوی عبدالرزاق شاکر۔

(۱۵) غالبیات چند عنوانات۔ ص ۱۵۶

(۱۶) عروض، آہنگ اور بیان۔ شمس الرحمٰن فاروقی۔ ص ۲۷

(۱۷) ماہنامہ شانِ ہند دہلی۔ اکتوبر ۱۹۸۲ء، ص ۱۳ غالب کی ایک ممتاز عد رباعی۔

(۱۸) اصلاح کے علاوہ میں نے استاذی جوش ملسیانی سے یہ دریافت کیا تھا کہ کیا اس طرح ہر مصرع کے شروع میں حرف بڑھا دینا جائز ہے؟ یہ نہیں پوچھا تھا کہ یہ کون سا وزن ہے؟

(۱۹) شانِ ہند دہلی۔ ص ۱۶، اکتوبر ۱۹۸۲ء

(۲۰) خط بنام صاحب عالم۔ ادبی خطوطِ غالب۔ انوار المطابع لکھنؤ ۱۹۳۸ء، ص ۷۷

(۲۱) علامہ سحر عشق آبادی مرحوم اور حضرت زار علامی کی بے راہ رویوں اور بے ادبیوں سے مجبور ہو کر میں نے ایک مبسوط اور مدلّل مضمون بعنوان "خرّم" ماہنامہ "پونا" کے ۱۹۹۰ء کے سالنامے میں لکھا ہے۔ شائقین ملاحظہ فرمائیں۔

غالب کے ایک قطعے کی اوّلین شرح

قدر بلگرامی شاگرد غالب[1] (سید غلام حسنین قدرؔ بلگرامی۔ اکتوبر ۱۸۳۳ء تا ستمبر ۱۸۸۴ء) تقریباً ساری عمر مدرّس رہے۔ آخری تقرر بطور مدرّس کیننگ کالج لکھنؤ میں ہوا۔ یہ ملازمت وسط ۱۸۷۷ء سے دسمبر ۱۸۸۴ء تک رہی۔ اس ملازمت کے آغاز میں یا اس سے کچھ پہلے جب کہ وہ تحصیل اسکول، موہنہ (ضلع لکھنؤ) کے صدر مدرّس تھے، اُنھوں نے چند درسی رسالے لکھنے کا ڈول ڈالا۔ ایسے ہی درسی رسالوں میں ایک رسالہ ''مجموعۂ سخن'' تھا جو دو حصوں میں شائع ہوا تھا۔ اس کا حصہ اوّل کم از کم چالیس سال تک درسی نصاب کے طور پر رائج رہا۔ میرے کتب خانے میں مجموعۂ سخن حصہ اوّل کے کئی ایڈیشن ہیں جن میں قدیم ترین مئی ۱۸۹۴ء کا ہے جو اکیسواں ایڈیشن ہے اور آخری ایڈیشن ۱۹۱۷ء کا ہے۔ یہ اکیسواں ایڈیشن (مطبوعہ نولکشور۔ لکھنؤ، مئی ۱۸۹۴ء) کسی فقیر محمد کی ملک رہ چکا ہے جو ''فارس روڈ میونسپل اردو اسکول بمبئی'' کا طالب علم تھا۔ یہ مجموعہ:

> ''مشتمل بر شعرائے متقدمین و سخنوران متاخرین (الف) مع اصول (ب) شعر و تذکرہ (ج) شعرا حسب ایمائے جناب کالن اے اوبرونگ صاحب بہادر ایم۔ اے۔ ڈائرکٹر سابق سررشتۂ تعلیم اودھ، پنڈت شیونراین صاحب ڈپٹی انسپکٹر مدارس ضلع لکھنؤ و مولوی محمد حکیم الدین صاحب ہیڈ ماسٹر چوک اسکول لکھنؤ و منشی غلام حسنین صاحب قدرؔ مرحوم ہیڈ ماسٹر مدرسہ موہنہ ضلع لکھنؤ پروفیسر فارسی

کیننگ کالج نے بہ کمال تحقیق و تفتیش اساتذۂ اردو ساکن لکھنؤ و دہلی
کے کلام فصاحت فرجام سے تالیف کیا اور صاحب محتشم الیہ کی
سفارش سے کلکتہ یونی ورسٹی کے سینٹ نے اردو انٹرنس کورس میں
داخل کیا واسطے منفعت عام طلبہ مدارس سرکاری کے باہتمام
کارپردازان سررشتہ تعلیم اودھ......"

جیسا کہ اس اقتباس سے ظاہر ہے۔

ا۔ مجموعہ اکیس شعرائے متقدمین و سخن وران متاخرین کے ۴۳ قطعوں اور نظموں پر مشتمل ہے، جن میں ایک قطعہ "عرضی گزارش حال پر ملال" اسد اللہ خاں غالب کے کلام سے ہے۔

ب۔ اصول شعر کا بیان صرف اس حد تک محدود ہے کہ ہر قطعے یا نظم کا وزن اور ارکان بیان کر دیے گئے ہیں۔ غالب کے قطعے کا وزن۔ "اے شہنشاہ آسماں اورنگ" کے لیے حاشیے میں درج ہے۔ "بحر خفیف مجنون محذوف فاعلاتن مفاعلن فعلن (فاعلاتن مفاعلن فعلن یا فعلان کہنا چاہیے۔)

ج۔ منظوم کلام کے بعد رسالے میں مشکل الفاظ کی فرہنگ اور ان تمام شاعروں کا کچھ حال بھی دیا گیا ہے جن کا کلام درج رسالہ ہے اگرچہ اقتباس میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ رسالہ "بہ کمال تحقیق و تفتیش" تالیف ہوا ہے۔ مگر یہ بات تذکرۂ شعرا، خصوصاً غالب کے تذکرے کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی کیوں کہ اس میں سنین کی متعدد غلطیاں ہیں۔ اندازہ ہے کہ یہ تذکرہ غالب کے انتقال کے آٹھ دس سال بعد ہی لکھا گیا ہے اور مؤلفوں میں غالب کے ایک برگزیدہ شاگرد اور دوست قدر بلگرامی بھی شامل ہیں مگر تعجب ہے کہ اس وقت تک غالب کے حالات زندگی (خصوصاً سنین) کے بارے میں واقفیت بہت نامکمل تھی۔ رسالے میں غالب کا سال ولادت ۱۷۹۵ء دیا ہے حالانکہ صحیح ۱۷۹۷ء (۲۷ دسمبر) ہے۔ وہ دلّی میں نہیں بلکہ آگرہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے چچا نصر اللہ بیگ خاں کی جاگیر یوں ہی ضبط نہیں ہو گئی تھی بلکہ ۱۸۰۶ء میں ان کے انتقال پر انگریزوں نے واپس لے لی تھی۔ غالب نہ ہی ۱۸۰۶ء کے فوراً بعد دلّی آ کر آباد ہوئے

تھے اور نہ اُنھوں نے گوشہ نشینی اختیار کی تھی۔ بلکہ اُنھوں نے ۱۸۱۲ء یا ۱۸۱۳ء میں دلّی میں مستقل سکونت اختیار کی تھی۔ اس سے چند سال پہلے سے ان کا دلّی آنا جانا تھا اور اسی دوران ۱۹ اگست ۱۸۱۰ء کو ان کی شادی بھی دلّی میں ہی ہو گئی تھی۔ گوشہ نشینی کا سوال ہی کہاں اُٹھتا ہے۔ تاریخ وفات کا تو کیا ہی کہنا ذیقعدہ ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۶ء یہ تو غالب کے انگریزی درباروں میں کرسی نشینی اور خلعت کے اعزاز کے دوبارہ اجرا کا زمانہ ہے۔ (۱۸۶۶ء سہو کتابت ہے ۱۸۶۲ء ہو گا) مگر تاریخ وفات تو بہر حال ۲ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ (۱۵ فروری ۱۸۶۹ء) ہی ہے۔[۲]

اگرچہ رسالہ مجموعۂ سخن بے حد مقبول ہوا اور اس کا دوسرا حصہ بھی منظر عام پر آگیا مگر پڑھنے والوں کے فہم سے بالاتر ثابت ہوا۔ چنانچہ جلد ہی اس کی شرح کی ضرورت پیش آئی وہ بھی بہت مقبول ہوئی اور چوتھی بار مطبع نولکشور لکھنؤ سے ۱۸۸۳ء میں چھپی۔ یہی ایڈیشن میرے پیش نظر ہے۔ نام "عطر مجموعہ" ہے اور یہ مجموعۂ سخن حصہ اوّل کی شرح ہے۔ سرورق کی عبارت یہ ہے۔

عطر مجموعہ۔ حصہ اوّل

تصنیفِ لطیف سخنورِ نامی گرامی واقفِ رموز و نکات سخن دانی سید غلام حسنین صاحب قدر حسینی واسطی بلگرامی شاگردِ رشید مرزا غالب دہلوی مرحوم۔

شرح حصہ اوّل مجموعۂ سخن

حسب الحکم جناب صاحب ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن ممالک مغربی و شمالی و اودھ واسطے تعلیم و تربیت طلبا مدارس صوبہ اودھ کے۔

چوتھی مرتبہ

مطبع نامی منشی نولکشور لکھنؤ میں چھپا ۱۸۸۳ء

کتاب ۳۰۰ سے زائد صفحات کو محیط ہے۔ پیش لفظ کی چند ضروری سطریں ملاحظہ کیجیے۔

رباعی

کی تو نے رباعی عناصر پیدا
پھر مثنوی باطن و ظاہر پیدا
کر متن سے توسیع طبیعت یارب
کر شرح سے انشراح خاطر پیدا

پیشتر مجموعۂ سخن کے دو حصے...... قطعہ

دُرِ درج حکمت مہِ برج رحمت
سحابِ فضیلت سمائے تبحر
اگر نام نامی کوئی مجھ سے پوچھے
ہے کالن برونگ صاحب بہادر

......ڈائرکٹر اودھ...... کے حکم سے طبع ہو کر گردنِ مدارس میں حمائل اور اس میں سب طرح کے مضامین شامل ہوئے۔ لیکن اکثر کمندِ افہام اس کے خانۂ معانی کے لب بام تک نہ پہنچی اور پہلوانانِ ہفت خوانِ سخن نے اس بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑ دیا۔ لہٰذا صاحب بہادر...... کے حکم کے موافق...... جناب پنڈت شیو نرائن...... ڈپٹی انسپکٹر لکھنو...... کی شہ پا کر ہیچمدان...... سید غلام حسنین قدر نے حصہ اوّل کی شرح حاصل المتن لکھ کر پتھر کو موم، موم کو پانی کیا اور اس رسالۂ مفید عام کا نام عطر مجموعہ رکھ دیا......"

شرح، مجموعۂ سخن کے چھپے ہوئے صفحوں کے مطابق مرتب ہوئی ہے۔ "جس مقام سے متن کا صفحہ بدلا گیا ہے۔ وہاں شرح میں بھی لفظ صفحہ لکھ کر صفحہ متن کے ہندسۂ پیشانی کا نشان کیا ہے۔" پورے منظومات کی شرح کی گئی ہے اور حق یہ ہے کہ تشریح میں قدر نے "واقفِ رموز و نکات سخن دانی" ہونے کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ مجموعۂ سخن میں غالب کا جو قطعہ شامل ہے یہ وہی ہے جو بقولِ حالیؔ، مرزا نے بادشاہ کے حضور میں اس درخواست کے ساتھ گزارا تھا کہ ان کی تنخواہ جو ششماہی گزرنے پر اکٹھی چھ مہینے کی ملا کرتی ہے وہ ماہ بہ ماہ ملا کرے چنانچہ اس درخواست کے موافق تنخواہ ماہ بہ ماہ ملنے لگی تھی۔ متداول دیوانِ غالب میں اس قطعے کا عنوان "گزارش مصنف بحضور شاہ" ہے اور مجموعۂ سخن میں "عرضی بگزارش حال

پُر ملال" قطعے کے کل شعر ۳۰ ہیں مگر مجموعۂ سخن میں ۲۵ شامل کیے گئے ہیں۔ یہ پانچ شعر چھوڑ دیے گئے ہیں:

آج مجھ سا نہیں زمانے میں
شاعر نغز گوے خوش گفتار

☆☆☆

رزم کی داستان گر سنیے
ہے زباں میری تیغ جوہر دار

☆☆☆

بزم کا التزام گر کیجیے
ہے قلم میرا ابرِ گوہر بار

☆☆☆

ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد
قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار

☆☆☆

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار

وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ غالب نے یہ قطعہ کب کہا تھا مگر وہ اپنے ایک خط مورخہ ۲ جنوری ۱۸۵۱ء کو منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں (نادراتِ غالب۔ ص ۸)

"اب چھ مہینے پورے ہو چکے، جولائی سے دسمبر ۱۸۵۰ء تک، اب میں دیکھوں یہ ششماہیہ مجھے کب ملتا ہے۔ بعد اس کے ملنے کے اگر آیندہ ماہ بہ ماہ کر دیں تو میں لکھوں گا ورنہ اس خدمت کو میرا سلام ہے۔ ابھی بابر کا حال حضور میں بھی نہیں بھیجا۔ کل مسودہ تمام ہوا ہے۔ صاف ہو رہا ہے اب صاف کر کر دے دوں گا اور ماہ بہ ماہ کی استدعا کروں گا۔ چھ ماہی آخر ہونے کو تھی، اس واسطے متوجہ ہو کر میں نے اس کو تمام کیا۔"

ظاہر ہے کہ کچھ عرصے بعد بابر کے حال کے ساتھ ہی مرزا نے یہ منظوم عرض داشت بھی بادشاہ کے حضور گزرانی ہوگی اور تنخواہ ماہ بہ ماہ ملنے لگی ہوگی اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامے تک یہی طریقہ رائج رہا ہوگا۔ اگرچہ جون ۱۸۶۰ء میں حکم ہو گیا تھا کہ پینشن سال میں دوبارہ ملا کرے گی۔ مگر یہ پینشن تھی تنخواہ نہ تھی۔ چنانچہ مرزا ۲۰ جولائی ۱۸۶۰ء کو ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں۔

(غالب کے خطوط۔ حصہ اوّل۔ ص ۳۲۲)

"آخر جون میں پنجاب سے حکم آیا کہ پینشن داران قدیم ماہ بہ ماہ نہ پائیں۔ سال میں دوبار بطریق ششماہہ فصل بہ فصل پایا کریں ناچار ساہوکار سے سود کاٹ کر روپیہ لیا گیا تا رام پور کی آمد میں مل کر صرف ہو۔ یہ سود چھ مہینے تک اسی طرح کٹوا دینا پڑے گا۔ ایک رقم معقول گھاٹے میں جائے گی۔"

پھر اسی ۱۸۵۱ء والی منظوم عرضی سے دو شعر اس خط میں چسپاں کرتے ہیں:

رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو کہ ہوں بقیدِ حیات اور چھ ماہی ہو سال میں دوبار

اب عطر مجموعہ سے غالب کے قطعے کے ۲۵ اشعار کی شرح پیش کی جاتی ہے:

۱۔

اے شہنشاہ آسماں اورنگ
اے جہاں دار آفتاب آثار

شہنشاہ، وہ بادشاہ کئی شاہ جس کے مطیع ہوں۔ اورنگ بفتح اوّل، تختِ سلطنت آسماں اورنگ، اسم صفت مرکب یعنی جیسا آسمان ہے ایسا تخت رکھنے والا، جہاندار اسم فاعل سماعی، جہاں کا رکھوالا۔ آفتاب، سورج، آثار، قدموں کے نشان، آفتاب آثار صفت مشبہ یعنی سورج کے مثل روشن نشانہائے قدم رکھنے والا۔ شہنشاہ موصوف آسمان اورنگ اس کی صفت ہے، اے حرف ندا۔ موصوف مل کر منادی ہوا۔ ندا منادی مل کر فاعل۔ سُن فعل امر حاضر مقدر۔ فعل امر ساتھ فاعل اور حرف ندا کے مل کر جملہ انشائیہ ہوا۔ مصرع دوم کی

ترکیب بھی ایسی ہے۔ مطلب۔ اے بادشاہ تیرا تخت آسمان کے مثل ہے اور جس طرح آفتاب آسمان پر ہے اسی طرح تیرے قدم مبارک تخت پر ہیں تو میری وہ بات سُن لے جو آیندہ بیان ہے۔ یہاں سریر سلطنت کو آسمان سے اور آثار قدم کو آفتاب سے تشبیہ ہے۔

۲۔

تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشیں
تھا میں اک دردمند سینہ فگار

بے نوا، مرد بے سامان اور درویش خاموش گوشہ نشین، خلوت میں بیٹھنے والا، مرادی معنی جس کو کوئی نہ جانے۔ دردمند صاحب درد فگار زخم و زخمی۔ سینہ فگار، اسم صفت مرکب جس کا سینہ زخمی ہو مرادی معنی نہایت دردمند۔ مطلب۔ میں ایک بے نوا تھا مگر کیسا بینوا جسے کوئی نہ پوچھے اور میں ایک دردمند تھا مگر کیسا دردمند جو قریب بہ مرگ ہو۔

۳۔

تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی
ہوئی میری وہ گرمیِ بازار

آبرو، عزت۔ گرمی بازار، شہرت، مطلب اے بادشاہ تمھارے عزت دینے سے میری وہ توقیر اور شہرت ہوئی جیسا آیندہ مذکور ہے:

۴۔

کہ ہوا مجھ سا ذرۂ ناچیز
روشناسِ ثوابت و سیار

ذرہ، چھر کا ریزہ جو آفتاب سے خاک میں چمکتا ہے۔ ذرۂ ناچیز، نہایت کم حقیقت شے۔ روشنا، روشن کرنے والا یہ لفظ روشنان کا مخفف ہے اور اس میں الف و نون فاعلی ہے۔ کذافی الغیاث۔ مگر راقم کے نزدیک خود لفظ روشن میں صرف الف فاعلی مل کر روشنا ہوا جیسے ہر اس سے ہراسا و گوار سے گوارا ثوابت ثابت کی جمع ہے وہ تارے جو گردش نہ کریں۔ جیسے کل تارے جو دکھائی دیتے ہیں۔ سبع سیارہ چھوڑ کر۔ سیارہ سیر کرنے والا اور وہ تارا جو گردش کرے جیسے مریخ و زحل وغیرہ بہ تحقیق بطلیموس سات ہیں اور بموجب نظام فیثاغورس ان

کی تعداد گیارہ ہے۔ مطلب۔ اے شہنشاہ تمھاری توجہ سے مجھ سا ایک ذرۂ حقیر بھی ستاروں کو رونق دینے لگا یعنی ستاروں سے بھی بلند اور رونق دار ہو گیا ایسے طالع جاگے۔

۵۔

گرچہ از روئے ننگ بے ہنری
ہوں میں[۴] اپنی نظر میں اتنا خوار

از روئے بمعنی بسبب، ننگ، شرم و غیرت بے ہنری، کوڑ مغزی، خوار، ذلیل، مطلب اگرچہ میرا یہ حال ہے کہ مجھ میں کوئی ہنر نہیں اور اس کوڑ مغزی کے سبب سے مجھے اس قدر ننگ و غیرت ہے کہ میں اپنے دل میں خود اپنے کو اتنا ذلیل و خوار سمجھتا ہوں جیسا آئندہ بیان ہے۔ یہ شعر اپنے مابعد سے قطعہ بند ہے۔

۶۔

کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی
جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار

اپنے کو، دہلی والے بجائے ذات خود استعمال کرتے ہیں اور اہل لکھنؤ اس مقام پر (آپ کو) بولتے ہیں اور قدما اس محل پر (اپنے تئیں) کہتے ہیں۔ مؤلف نثر میں یہاں اہل دہلی کا اور نظم میں لکھنویوں کا مقلد ہے۔ خاکی، خاک کا بنا ہوا شخص۔ عار، ننگ و شرم۔ مطلب۔ اگر اپنے کو میں یہ کہوں کہ خاکی جسم رکھتا ہوں اور خاک یہ بات سن لے تو خاک کو بھی غیرت آئے کہ ناحق مجھ سے ایسا بشر پیدا ہوا جو اتنا بے ہنر نکلا۔

۷۔

شاد ہوں لیک[۵] اپنے جی میں کہ ہوں
بادشہ کا غلام کار گزار

پہلے مصرعے کا (ہوں) دوسرے مصرعہ میں لگا کر پڑھو تو معنی شعر آئینہ ہیں۔ کار گزار قابل و لائق، مطلب، باوجود اس قدر ذلت کے میں اپنے دل میں اس بات پر خوش ہوں کہ تم مجھے اپنا غلام سمجھتے ہو اور پھر کیسا غلام کہ لائق۔

۸۔

خانہ زاد اور مُرید اور مدح
تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ[6] نگار

خانہ زاد، اصطلاحاً بمعنی غلام زادہ واستعمالاً بجائے کمترین۔ مُرید، چیلا، مدح، تعریف کرنے والا، مراد شاعر سے بھی لیتے ہیں۔ عریضہ نگار، خط لکھنے والا یہاں مراد اس قطعہ گو سے ہے۔ مطلب۔ میرے واسطے تین خدمتیں مقرر تھیں ایک تو آپ کا میں خانہ زاد تھا، یعنی میرے باپ، دادا اسی خاندان کے پرورش یافتہ تھے۔ دوسرے میں آپ کا مرید تھا تیسرے میں آپ کا مدح تھا۔ واضح ہو کہ بہادر شاہ بادشاہ اخیر دہلی کو مذہب صوفیہ کی طرف نہایت توجہ تھی۔ خود بدولت پیر بنے تھے اور چند عمائد کو اپنا مرید بنایا تھا ان لوگوں نے بھی ازروئے تصنع مریدی اختیار کر لی تھی چنانچہ حضرت استاد مرحوم نور اللہ مرقدہ نے بھی ازروئے تقیہ یہ امر گوارا کر لیا تھا۔ غلام کارگزار اور عریضہ نگار سے مراد یہاں خود حضرت غالب۔

۹۔

بارے نوکر بھی آگیا صد شکر
نسبتیں ہوگئیں مشخص چار

بارے، دفعتہً واتفاقاً نسبت، آپس کا لگاؤ۔ مشخص، تجویز، مطلب۔ تین باتوں میں بندہ آپ سے منسوب تھا جیسے اُوپر خبر دی اب میرے نوکر ہونے سے مجھ میں اور آپ میں گویا چار نسبتیں تجویز و مقرر ہوگئیں۔

۱۰۔

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں
مدعائے ضروری الاظہار

ضروری الاظہار مدعا، وہ مقصد جس کا بیان کرنا ضرور اور واجب ہو۔ تم سے نہ کہوں تو کس سے کہوں یہ اصطلاح اپنے مطلب کو بہ خوشامد بیان کرنے کی حالت میں لاتے ہیں اور اس سے عرضِ حال اور سماعتِ مطالب میں تاکید ہو جاتی ہے۔ مطلب۔ یہ ضروری مدعا اگر آپ سے نہ کہوں تو کون سننے والا ہے ذرا مجھ پر توجہ فرمایئے کہ میرا مقصد آگے بیان ہے۔

۱۱۔

پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں
ذوق آرائشِ سر و دستار

پیر و مرشد منادی بجائے خداوند نعت آتا ہے، اس کے ساتھ حرف ندا مقدر لاتے ہیں۔ ذوق، ذائقہ و شوق، آرائش، درستی اور بناؤ، دستار، پگڑی، مطلب۔ اے پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو اپنے سر کی آرائش کا شوق نہیں کہ پگڑی سے اسے آراستہ رکھا کروں اور پگڑی کی آراستگی کا بھی ذوق نہیں کہ ہمیشہ عمدہ ہی پگڑی باندھا کروں، ننگے سر رہوں تو واہ واہ اور میلی کچیلی، موٹی مہین جیسی پگڑی ملے اس پر راضی، مگر کچھ تو مجھے ضرور چاہیے جیسا آگے مذکورہ ہے۔

۱۲۔

کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر
تا نہ دے بادِ زمہریر آزار

آخر، اصطلاح میں ضرور کے محل پر آتا ہے۔ باد، ہوا، بادِ زمہریر، سرد ہوا۔ آزار، تکلیف و بیماری، مطلب۔ چاہے سر برہنہ رہوں چاہے موٹی جھوٹی پگڑی ہو یہ باتیں گوارا ہو سکتی ہیں مگر جاڑوں میں ننگے بدن تو نہیں رہا جاتا رضائی وگلا وغیرہ کچھ تو ضرور نصیب ہونا چاہیے تاکہ جاڑا نہ کھاؤں۔

۱۳۔

کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش
جسم رکھتا ہوں، ہے اگرچہ نزار

درکار، ضروری۔ پوشش، پہننے کے کپڑے، یہاں جڑاول سے مراد ہے۔ جسم، بدن، نزار، دبلا۔ مطلب۔ اگرچہ میرا بدن دبلا ہے، کچھ لکڑی پتھر نہیں بلکہ ضعیف اور لاغر کو سردی زیادہ اور جلد اثر کرتی ہے، پھر مجھے کپڑوں کی ضرورت اور جڑاول کی حاجت کیوں کر نہ ہو، آپ ہی داد دیجیے اور رحم کیجیے۔

۱۴۔

کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال
کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار

خریدا، مصدر خریدنا کا ماضی مطلق، مستحسن الترک۔ بمعنی خرید کیا بنانا محاورہ ہے لفظ (کپڑے) بھی کپڑے بنانے کے محل پر آتا ہے اور عوام ہنود اس لفظ کو کھانا پکانے کے مقام پر استعمال کرتے ہیں اور گستاخ گر دیہاتی شعر کہنے کی جگہ پر بولتے ہیں اور اصطلاحاً کسی کو بے وقوف بنانا یہاں بمعنی اوّل ہے۔ مطلب۔ میں نے اب کے جاڑوں میں کچھ کپڑا مول نہیں لیا کہ دام ہی گرہ میں نہ تھے اور کچھ جڑاؤل نہیں بنائی کہ کپڑا ہی نہ تھا۔ جامہ ندارم دامن از کجا آرم۔ غرض جاڑا کھا رہا ہوں۔

۱۵۔

رات کو آگ اور دن کو دھوپ

بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار

بھاڑ میں جانا اب محاورہ، محل خفگی کے وقت دور ہونے کے محل پر بولتے ہیں۔ لیل، شب، نہار، روز لیل و نہار، ایامِ زندگی۔ مطلب۔ رات بھر آگ اور دن بھر دھوپ کے سہارے زندگی بسر کرتا ہوں ایسے زندگی کے دن خدا دور کرے تو بہتر یعنی اس تکلیف سے مرنا اولیٰ ہے۔

۱۶۔

آگ تاپے کہاں تلک انسان

دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار

مطلب، آدمی سے نہ عمر بھر آگ تاپ کر زندگی بسر کی جاتی ہے اور نہ ہمیشہ دھوپ کھا کر دن کاٹے جاتے ہیں پھر مجھ سے کیوں کر ہو سکے۔

۱۷۔

دھوپ کی تابش آگ کی گرمی

وقنا ربنا عذاب النار

تابش، تافتن کا حال مصدر، یہاں دھوپ کی تیزی سے مراد ہے۔ مطلب، یہ دھوپ کی تیزی اور یہ آگ کی گرمی ہم پر پڑتی ہے گویا ہم جہنم میں دن رات جل رہے ہیں، پس اے ہمارے پروردگار اس دوزخ کے عذاب سے ہم کو بچالے۔ وقنا ربنا عذاب النار (یہ ایک

دعا کا جملہ ہے شاعر نے بطریق تضمین اپنی نظم میں ملا لیا (تضمین) غیر کا کلام اپنے کلام میں ملا لینا مگر اس خوب صورتی سے کہ دونوں مل کر معنی میں ایک ڈال ہو جائیں اور یہ امر داخل صنعت ہے اگر اس کلام کو لوگوں نے اس کے مصنف کے نام سے کم سنا ہو تو قائل کا نام بھی بیان کرنا ضرور ہے جیسے ناسخ کا مصرع حضرت غالب نے لے کر ان کا نام کہہ دیا:

غالب اپنا بھی عقیدہ ہے بقولِ ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

تضمین ایک عیب کا بھی نام ہے۔

۱۸۔

میری تنخواہ جو مقرر ہے
اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار

ہنجار، طریقہ و قاعدہ ورسم و راہ۔ مطلب۔ میرا مہینہ جو آپ نے مقرر کیا ہے۔ عجب طرح سے ملا کرتا ہے جیسا آیندہ کورہے۔

۱۹۔

رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار

رسم، قاعدہ و قانونِ قومی، چھ ماہی وہ فاتحہ جو مرے کے چھ مہینے کے بعد ہو اور وہ ایک ہی بار ہوتا ہے پھر جو اس سے چھ مہینے کے بعد فاتحہ کرتے ہیں اسے برسی کہتے ہیں۔ مدار، جائے دور یہاں بمعنی عمل ہے۔ مطلب۔ مردے کی چھ ماہی کا ایک ہی بار دستور ہے اور خلق اللہ کا اسی قاعدے پر عمل چلا آتا ہے۔

۲۰۔

مجھ کو دیکھو تو ہے ہوں بقیدِ حیات
اور چھ ماہی ہو سال میں دوبار

مجھ کو دیکھو یعنی میرے پر خیال کرو، یہ محاورہ مخاطب کو متوجہ کرنے کے واسطے لاتے ہیں۔ بقیدِ حیات ہونا۔ بطریق استعارہ بمعنی زندہ رہنا۔ مطلب۔ میرے حال پر ذرا خیال کیجے

کہ باوجودے کہ زندہ ہوں مگر ایک ایک سال میں دو دو بار چھ ماہی ہوتی ہے جو بات مردے کے واسطے نہیں ہوتی وہ میرے واسطے ہوتی ہے..... یعنی چھ مہینے چڑھ کر حضور کی سرکار سے تنخواہ ملا کرتی ہے۔ واضح ہو کہ بہادر شاہ کی سرکار میں ششماہہ تقسیم ہوتا تھا۔

۲۱۔

بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض
اور رہتی ہے سود کی تکرار

بسکہ، نہایت۔ مطلب۔ میرے ہر مہینے میں قرض لینے اور سود بڑھنے کے سبب وہ ہوتا ہے جو شعر آیندہ میں ہے۔

۲۲۔

میری تنخواہ میں تہائی کا
ہو گیا ہے شریک ساہوکار

ایک چیز کے تین برابر حصے کر کے ایک حصے کا نام تہائی ہے، شریک، ساجھی۔ ساہوکار، مہاجن۔ مطلب تہائی تنخواہ میری سود ہی میں بھگت جاتی ہے، ساہوکار کیا ہے گویا میری تنخواہ کا شریک پیدا ہوا ہے یعنی اس ایک تنخواہ پر میں اور ساہوکار دونوں پکے نوکر ہیں۔

۲۳۔

میری تنخواہ کیجئے ماہ بہ ماہ
تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

ماہ بہ ماہ، مہینے مہینے برابر وصول ہونے والی تنخواہ۔ دشوار، سخت ناگوار و مشکل مطلب، ماہ بہ ماہ میری تنخواہ ادا کر دیا کیجے تاکہ میں بے قرض دوام بہ خوبی زندگی گزار سکوں۔

۲۴۔

ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام
شاعری سے مجھے نہیں سروکار

ختم، تمام، شاعری سے غرض، یہاں بے اندازہ مدح۔ سروکار، غرض و مطلب۔ مطلب، اب میں یہ قطعہ دعا پر ختم کرتا ہوں یعنی اس عرضی کے آخر میں ایک دعائیہ شعر

لکھ کر عرضی بند کرنے کا ارادہ ہے زیادہ شاعری یہاں مجھے خرچ کرنی نہیں منظور، طول دینے سے کیا مطلب فقط دعا کافی ہے۔

۲۵۔

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

سلامت، پورا رہنا، مراد ی معنی زندہ رہنا۔ یہی دعائیہ شعر ہے جس کا ذکر شعر ماقبل میں آچکا ہے۔ مطلب دنیا میں ہر ایک سال تین سو پینسٹھ دن کا ہوتا ہے مگر یہاں شاعر کی مراد یہ ہے کہ خداوند قدیر ایک ایک سال پچاس پچاس ہزار دن کا بنادے اور پھر بادشاہ کی عمر انہیں دنوں کے حساب سے ہزار برس کی ہو۔ اس حساب سے بادشاہ کی عمر بقیہ ایک لاکھ چھتیس ہزار نو سو چھیاسی سال سے کچھ زیادہ ہو گی۔ ایسی زیادہ گوئی کو فن شعر میں اغراق کہتے ہیں۔

حواشی

(۱) اصل میں قدؔر نے چار استادوں سے اصلاح لی تھی۔ ان کے نام یہ ہیں، شیخ امام علی سحؔر، فتح الدولہ مرزا محمد رضا برقؔ، امداد علی بحؔر، مرزا غالبؔ چنانچہ ایک رباعی میں ان چاروں کا ذکر کیا ہے:

سیکھے سحؔر و برقؔ سے بندش کے بند پھر غالبؔ و بحؔر نے بتائے پیوند
مجھ سا بھی زمانے میں نہ ہوگا اے قدؔر! بدنام کنندۂ نکو نامے چند"

(۲) تذکرے میں لکھا ہے کہ غالب "فارسی میں ایک آتش پرست کے شاگرد تھے......" ظاہر ہے کہ یہ اشارہ مُلّا عبدالصمد کی طرف ہے اور یہ بیان غالب کے شاگرد قدؔر بلگرامی کے ایما سے شامل کیا گیا ہے گویا حالؔی کے تائیدی بیان اور حکیم غلام رضا خاںؔ کے تردیدی بیان کے بعد، قدؔر کا یہ بیان غالب کے تیسرے عزیز کا بیان ہے جو اتفاق سے مُلّا عبدالصمد اور غالب کے تعلق کی تائید کرتا ہے۔

(۳) غالب کے متداول دیوان کے قلمی نسخوں اور حیاتی ایڈیشنوں میں "روشناس" درج ہے یعنی ثوابت وسیار مجھے پہچاننے لگے۔ روشنائے صرف قدؔر نے لکھا ہے۔ نہ جانے کہاں سے لیا ہے۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ قدؔر نے روشنائے ثوابت وسیار، کہہ کر شعر کو جو معنی پہنائے ہیں وہ قابل غور ہیں۔

(۴) "میں" کی جگہ "خود" ہونا چاہیے۔

(۵) صحیح "لیکن"۔

(۶) نظم طباطبائی لکھتے ہیں کہ "لفظ عریضہ مولدین کی گڑھت ہے۔ عربی صحیح میں ان معنی پر نہیں آیا۔" نہ آیا ہوگا مگر اردو میں غالب کے عہد تک زبانوں پر درخواست کے معنوں میں رائج ہو چکا تھا۔ جیسے منیر:

نوشتہ ہے منیر بے نوا کا
شہنشہ کو عریضہ ہے گدا کا

(۷) نظم طباطبائی فرماتے ہیں۔ "......انسان کے لباس کو پوشش اردو کے محاورے میں نہیں کہتے فارسی میں درست ہو......" لیکن غالب کے عہد تک پوشش انسان کے لباس کے معنی میں رائج ہو چکا تھا جیسے ظفر:

ہم وہ بے برگ و نوا ہیں وقتِ مستی ساقیا
پوشش اپنی برگ ہائے تاک سے پیدا ہوئی

(۸) نسخہ اول دیوان میں "کہ" کو ر یہی صحیح ہے۔

(۹) بعض نسخوں میں "چہارم" ہے۔ سو کے لحاظ سے "تہائی" میں زیادہ مبالغہ ہے۔

کنز المطالب شرحِ دیوانِ غالب میں شارح کے کچھ ذاتی مشاہدے

اس شرح کے "حرف آغاز" میں، خیر بہوروی مرحوم لکھتے ہیں:

۱۔ "پیش نظر شرح "کنز المطالب شرحِ دیوانِ غالب" مولانا ابوالحسن ناطق گلاؤٹھوی کی تصنیف ہے۔ مولانا ناطق، مرزا داغ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں بڑے صاحبِ فن استاد مانے جاتے ہیں......"

پھر لکھتے ہیں:

۲۔ "امید ہے یہ مفید شرح جو غالبیات میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے، دیوانِ غالب ہی کی طرح مقبول ہوگی......"

خیر مرحوم مندرجہ بالا اقتباسات سے چند سطریں پہلے یہ لکھ چکے تھے:

۳۔ "......بیذھب بنارسی کی شرح...... تخلص کی مناسبت سے "بیذھب" بھی ہے اور "کذھب" بھی۔ اسی طرح کی مہمل اور گمراہ کن شرحیں اور بھی چھپی ہیں۔

آپ چاہیں...... جوش ملسیانی کی شرح کے لیے غالب کے اس شعر کو عنوان بنا سکتے ہیں:

خامہ انگشت بہ دنداں کہ اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

معلوم نہیں، خیر صاحب نے جناب جوش ملسیانی اور ان کی شرح غالب پر نزلہ کیوں

اشارہ حالانکہ جو کچھ (۱)، (۲) کے تحت جناب ناطق مرحوم اور ان کی شرح دیوانِ غالب کے لیے تحیر صاحب نے کہا ہے، اگر اس سے زیادہ نہیں تو کم از کم اتنا تو جناب جوش اور ان کی شرح دیوانِ غالب کے لیے بھی کہا ہی جا سکتا ہے اور یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ جہاں "کنز المطالب" صرف ایک ہی بار چھپی، جناب جوش ملسیانی کی شرح دیوانِ غالب کے ۱۹۵۸ء تک پانچ ایڈیشن نکل چکے تھے۔ جوش صاحب اور ناطق صاحب کے مابین خط و کتابت [۲] سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر دو شاگردانِ داغ میں علمی، ادبی اور فنی سطح پر بے حد یگانگت تھی۔ قبلہ جوش ملسیانی میرے استاد تھے تاہم میری نظر میں یہ دونوں بزرگ یکساں طور پر اعلیٰ مقام پر فائز ہیں۔

جناب ناطق مرحوم نے "کنز المطالب" بڑی دقت نظری سے تصنیف کی ہے اس میں زبان و بیان کے بھی بہت سے نکتے زیر بحث لائے گئے ہیں اور ناطق صاحب نے تقریباً سب پر ضمنی فیصلہ بھی صادر فرمایا ہے۔ ان میں کے بعض مشاہدات ایسے ہیں جو ذاتی ہیں اور جناب ناطق ہی سے مخصوص ہیں۔ ذیل میں انھیں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ بعض مقامات پر میں نے حواشی کا اضافہ کر دیا ہے۔ جس کا مقصد جناب ناطق مرحوم کی خامیاں نکالنا نہیں بلکہ حقائق کو صحیح تر شکل میں پیش کرنا ہے۔

۱۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

نقشِ ہستی اپنے مصور یعنی صانع کی اس شوخ نگاری کا شاکی ہے کہ اس نے میری ہر تصویر کو کاغذی پیراہن پہنایا یعنی بے حقیقت بنایا اس میں جو بیان استفسار ہے اسے طنزیہ لیا جائے اور صانعِ قدرت مخاطب مانا جائے تو حسنِ بیاں پیدا ہوتا ہے:

گیا حسن خوبانِ دلخواہ کا ہمیشہ رہے نام اللہ کا
(ناطق)

ثباتِ نقشِ ہستی دیکھ کر تحریر ہنستی ہے طرب آمادۂ تمثال پر تصویر ہنستی ہے

خود مصنف نے اس شعر کی یوں تشریح کی ہے کہ تصویر چوں کہ کاغذ پر ہوتی ہے اس لیے اسے فریادی کہا کیوں کہ ولایت ایران میں فریادی کاغذی پیراہن پہن کر عدالت میں جاتے تھے۔ مطلب یہ کہ چوں کہ ہستی موجب ملال و آزار ہے اس لیے تصویر بھی اپنے صانع کی بہ زبان حال شکایت کرتی ہے کہ مجھے بنا کر کیوں مبتلائے رنج ہستی کیا۔ مرزا کے بیان کردہ مطلب پر لوگوں کا یہ اعتراض کہ ایران میں ایسا رواج ہونے کا ثبوت نہیں ملتا اس لیے اسے مہمل ٹھہراتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا ثبوت اگر نہ بھی ہو تو شعر کو مہمل نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ کاغذی پیراہن کی اصطلاح کا وجود بمعنی فریادی ایران کی شاعری میں موجود ہے۔

مثلاً:

(کلیم کاشانی)

کاغذی جامہ بپوشید و بدرگاہ آمد   زادۂ خاطر من تا بدہی داد مرا [۳]

خود مصنف نے بھی ایک اور شعر اسی اصطلاح کا لکھا ہے جو اگرچہ اس دیوان میں نہیں آیا مگر نسخۂ حمیدیہ اور مولانا آسی کے غیر مروجہ دیوانِ غالب میں موجود ہے:

(غالب)

تیرے بیمار پہ ہیں فریادی   وہ جو کاغذ میں دوا باندھتے ہیں [۴]

مومن خاں کے دیوان میں بھی یہ شعر موجود ہے۔

مومن:

تظلم فرق معنی کے سبب تھا   لباسِ کاغذی بے وجہ کب تھا

اس سے معلوم ہو گیا کہ اگر یہ امر واقعہ بھی نہیں تو تخئیل شعر میں ضرور داخل ہے ایسی حالت میں اگر کوئی خیال غلط واقعہ سے بھی متعلق ہو تو شاعر پر اس کی ذمہ داری نہیں آتی مثلاً اگر آج محمل لیلیٰ اور ملاقات مجنوں کے واقعہ کو غلط ثابت کر دیا جائے تو معترضین غالب خود بھی اس پر آمادہ نہ ہوں گے کہ اس مضمون کے تمام اشعار کو جواب تک لکھے گئے ہیں مہمل قرار دے دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فنِ سخن میں بنیادِ تخئیل ہمیشہ واقعاتِ مشہورہ پر ہوتی ہے چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہوں۔ [۵]

(۲)

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

......لفظ "پرے" متقدمین نے کثرت سے نظم کیا ہے اور اب تک دہلی اور اس کی نواح میں زباں زدعام ہے اضلاع میرٹھ، بلند شہر اور علی گڑھ کے اہل علم اور شرفاء بکثرت بولتے ہیں اور یہ اضلاع قصبہ سردھنا سے لے کر شہر علی گڑھ تک آج بھی دہلی کی قدیم اردو کے مرکز ہیں، یہاں کے قصبات میں ان اثرات نے دخل نہیں کیا جو بعد میں دہلی پر چھاگئے اس لیے آپ کو یہ سن کر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ آج تک اس نواح کے لوگ میر و سودا کی زبان کے بہت سے الفاظ اور محاورے بلا ردوبدل استعمال کرتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ قصبات دہلی سے زیادہ فصیح سمجھے جانے کے مستحق ہیں کیوں کہ اگر آج دہلی اور لکھنؤ کے پاس شعرائے حال کی سند ہے تو اس علاقے کے پاس جو نواحِ دہلی کہلاتا ہے۔ میر، سودا، درد، غالب، مومن اور ذوق کے الفاظ کی سند موجود ہے اس لیے جن لوگوں نے اپنی زبان بدل ڈالی انھیں یہ حق نہیں کہ ان لوگوں پر اعتراض کریں جو اپنی آبائی زبان کو ہنوز قائم رکھے ہوئے ہیں اور وہی بولتے ہیں۔ آخر عرب میں بھی تو یہی ہوا تھا کہ جب شہروں کی زبان میں عجمی الفاظ نے آکر دخل کرلیا تو پھر شہروں کی سند نہیں رہی اور قصبات ودیہات کی زبان مستند ہوگئی مگر ان قصبات ہی سے بحث نہیں لفظ "پرے" تو اب تک دہلی اور اکبر آباد میں بھی بے تکلف بولا جاتا ہے۔ مرزا داغ نے دہلوی ہوتے ہوئے جواب سے پچاس برس پہلے اسے ترک کردیا تو اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ آپ قیام رام پور کے زمانہ میں اہل لکھنؤ سے گھرے ہوئے تھے۔ اس لیے لکھنؤ والوں میں رہ کر ان کے متروکات

کو خود تنہا استعمال کرنا پہلے تو نامناسب سمجھا اور بالآخر یہ لفظ ان کی زبان سے اُڑ گیا اس طرح داغؔ مرحوم نے اسے متروکات میں شامل کر کے دہلی کی زبان کے ساتھ بے انصافی کی مگر مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ حضرت داغؔ اس لفظ کو اخیر تک نہایت فصیح سمجھتے تھے چنانچہ سنا ہے کہ اس لفظ سے بحث کرتے ہوئے آپ نے حیدر آباد میں ایک لکھنوی اہلِ ادب کو یہ شعر سنایا:

(مومنؔ)

چل پرے ہٹ مجھے نہ دکھلا منھ
اے شبِ ہجر تیرا کالا منھ

اور فرمایا کہ اگر یہاں "پرے ہٹ" کی جگہ "ادھر جا" پڑھا جائے تو نہ وہ خوبی باقی رہے گی نہ زورِ بیان۔ مولانا داغؔ دہلوی نے اس لفظ کو اپنی غزلوں میں کثرت سے استعمال کیا ہے۔

(داغؔ)

چل سرک لمبی ہو میرے گھر سے ٹل فرقت کی رات
ہٹ پرے جا دُور کالا منھ نکل فرقت کی رات

حضرت بیانؔ یزدانی نے بھی اس لفظ کو نظم اور نثر دونوں میں استعمال کیا ہے۔ حضرت داغؔ مرحوم نے اہلِ لکھنؤ کے پاسِ ملاقات سے کہیے یا فضول اعتراضوں سے بچنے کے لیے دہلی کے کئی الفاظ کو بلا ذاتی وجہ کے ترک کر دیا اور کئی الفاظ میں تذکیر و تانیث کا بھی تصرف کیا ہے جسے میں درست نہیں سمجھتا اور حضرت اطہرؔ ہاپوڑی بھی اس معاملہ میں میرے ہم خیال تھے۔ یہاں ایک واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ مولوی عبدالباری صاحب آسیؔ متوطن قصبہ الدین ضلع میرٹھ جو ایک عالم بھی تھے، کثیر التصانیف بھی اور لکھنؤ کے بڑے اساتذہ میں بھی جن کا شمار تھا، جن کی تحقیق بھی قابلِ قدر ہے، میرے شاگرد اور

دوست ہی نہیں عزیز بھی ہیں۔ آپ میرے اشعار کو عقیدت سے سنتے تھے اور میرے لیے سراپا داد تحسین تھے۔ آپ نے میرے اشعار کو سن کر ایک مرتبہ نہایت خلوص کے ساتھ فرمایا کہ یہ یہ لفظ اور یہ یہ محاورے لکھنؤ میں نہیں اور لکھنؤ والے انھیں پسند نہیں کرتے اس لیے اگر آپ انھیں درست فرمالیجیے تو بہتر ہوگا۔ میں نے جواب دیا بھائی لکھنؤ کی سند نہیں تم یہ کہو کہ تمھارے گھر کی زبان کے بھی یہ الفاظ اور محاورات ہیں یا نہیں تو فرمایا کہ ہاں ہیں اور نہایت فصیح ہیں اس پر میں نے کہا تو پھر آپ لکھنؤ کے اثر سے اپنی زبان کو بدل لیجیے اور مجھے اپنے اثر سے دکن کی زبان بدلنے کے لیے چھوڑ دیجیے۔ لکھنؤ کی زبان تو یہ ہے کہ یہاں تعالیٰ اللہ کے محل استعمال میں معاذاللہ بے تکلف بولا جاتا ہے، تم ایسا بولتے ہو۔ اس کے بیان سے مقصد یہ ہے کہ جب حضرت آسی کی جیسی ہستی پر ماحول کا اثر ہوئے بغیر نہ رہا جو نہایت سخت اور جھگڑالو مشہور تھے تو حضرت داغ کا متاثر ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں جو خاموش اور صلح پسند تھے۔ میں اپنے برادران خواجہ تاش سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ایسے الفاظ کے متعلق اپنی ذاتی تحقیق سے بھی کام لیا کریں۔ حضرت قدا گلاؤٹھوی بھی جو داغ کے ایک قدیم اور مایہ ناز شاگرد تھے اس معاملہ میں میرے ہم خیال تھے اور حضرت رسا گلاؤٹھوی ثم الرام پوری بھی ہم سے متفق تھے۔

(۳)

دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کروں کیا، کارفرما جل گیا

جس کام کا کرنے والا نہ رہے اس کی حالت نگرانی نہ ہونے کی وجہ سے آپ ہی آپ ابتر ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں میرے سینہ کے گلہائے داغ کی بہار اور تابانی دیکھنے کے قابل تھی مگر اب کیا بتاؤں کہ جس ہستی کی

حسن کار گزاری سے اس میں چراغاں کا عالم پیدا ہو گیا تو داغوں کی بہار کس کے بھروسہ پر باقی رہتی۔ یہاں ایک لطیفہ یاد آیا جس کا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ برطانیہ میں جب گھڑی کی ابتدا ہوئی تو ایک دیہاتی انگریز نے بڑی دیوار گھڑی لا کر اپنے یہاں لگائی جو سال دو سال چلنے کے بعد بند ہو گئی میم صاحب نے صاحب سے شکایت کی کہ گھڑی چلتی نہیں تو صاحب نے گھڑی کو اتار کر کھولا اور اسے غور سے دیکھا تو اتفاقاً ایک چوہا مرا ہوا ڈائل کے نیچے انھیں نظر آیا یہ دیکھ کر صاحب بہادر میم صاحب سے بولے کہ گھڑی چلے کیوں کر اس کا تو انجینئر ہی مر گیا۔

(۴)

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

جنازہ اٹھنے میں تشہیر ہے اور قبر انگشت نمائی کے لیے نشان اگر ہم یوں نہ مرتے اور کہیں بحر ظلمات میں جا کر ڈوب رہتے تو یہ رسوائیاں کیوں ہوتیں، لارڈ کچنر کی طرح سب باتوں سے بے نیاز ہو کر سوتے۔

(۵)

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

اگر بادہ خواری کی بُری لت تجھے لگی ہوئی نہ ہوتی تو اے غالب تیرے بیان میں جو مسائلِ تصوف ہوتے ہیں وہ ایسے ہیں کہ ہم تجھے ولی سمجھتے۔ بعض اصحاب غالب کے اشعار کی مسائلِ تصوف سے تشریح کرتے ہیں جو اکثر میں نے بھی کی ہے اور بالکل اس بیان کے مطابق ہے لیکن یار لوگ اس پر خواہ مخواہ کی نکتہ آرائی کا الزام بھی لگا دیتے

ہیں۔ غالب مسائل تصوف لکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں تو بھی تصوف سے ان کے کلام کی شرح کرنے پر اعتراض ہوتا ہے لیکن اُنھوں نے اہل سیاست ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا اس پر بھی ڈاکٹر سید محمود صاحب نے ان کے بہت سے اشعار پر سیاست حاضرہ کے معانی کا جامہ پہنا دیا ہے مگر اُنھیں کوئی کچھ نہیں کہتا۔

(۶)

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہو گی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا......

اس پر ایک قصہ یاد آیا۔ میں ۱۹۳۰ء میں لکھنؤ گیا تھا گرمی کا موسم تھا، مولانا آسی کے وہاں مقیم تھا، وہ مجھے اپنے ایک دوست کے وہاں ملاقات بازدید کے لیے لے گئے اُنھوں نے فالودہ سے تواضع کی جو کسی مشہور دوکان سے منگوایا گیا تھا۔ مجھے یہ فالودہ پسند نہ آیا مگر خاطراً تعریف ضرور کی اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ بھوپال میں عرب کی دوکان کا فالودہ جس قدر نفیس ہوتا ہے ایسا ہندوستان بھر میں کہیں نہیں دیکھا۔ وہاں ایک صاحب قدیمی وضع کے دیرینہ سال بھی بیٹھے ہوئے تھے وہ یہ سن کر بگڑ گئے اور بے ساختہ کہہ واللہ قبلہ آپ بھی کیسی ناگوار باتیں کرتے ہیں۔ لکھنؤ کی نفاست تو دنیا بھر کو نصیب نہیں۔ اس وقت ان کے تیور کچھ ایسے تھے کہ اگر میں جواب دینے کی جرأت کرتا تو یقیناً لڑ پڑتے۔

(۷)

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

جس طرح قطرہ کے لیے سامان عشرت دریا میں فنا ہو جاتا ہے کہ یہ جزو اپنے کل میں شامل ہو کر کل ہو جاتا ہے۔

ع: قطرہ ہے دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
اسی طرح درد کے لیے بھی درد کا حد سے گزر جانا دوا ہو جاتا ہے کہ فنا ہو کر مبدءٔ ذات میں شامل ہو جاتے ہیں جو نہ صرف یہ کہ دوائے درد ہے بلکہ سامانِ عشرت دوام بھی ہے۔

(ناطق)

نجاتِ دہر کا باعث ہوا دورِ تسلسل سے
فنا جو ہو گیا کل میں وہی جز بڑھ گیا کل سے

میرے اس شعر پر لکھنؤ کے ایک پروفیسر صاحب نے جو خوش قسمتی سے ایک مشہور شاعر مرحوم کے صاحب زادے بھی ہیں یہ اعتراض کیا کہ "جز کل سے مسلماتِ علمی کے مطابق ہرگز نہیں بڑھ سکتا"۔ جب مجھ تک ان کا یہ اعتراض پہنچا تو میں نے کہا کہ "شعر مرا بہ مدرسہ کہ برو"۔ کاش پروفیسر صاحب کو یہ معلوم ہوتا کہ قافیہ کا "گُل" "جز" کے مقابلہ کا نہیں۔

(۸)

افسوس کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے
جن لوگوں کی تھی درخورِ عقدِ گہر انگشت

بعالم تعجب و حسرت افسوس! دانتوں میں انگلی دبانے کی رسم ہے۔ "عقدِ گہر" ہونے کا اردو میں موزوں ترجمہ "سونے چاندی سے کھیلنا ہوگا۔ موتیوں کے ساتھ دانتوں کو جو مناسبت ہے وہ ظاہر ہے۔ یہ بات قرین قیاس ہونا چاہیے کہ اہل کمال سونے چاندی سے کھیلیں یعنی وہ اہل دولت ہوں یہ ناقدر شناسی فلک یا جور زمانہ کی شکایت کرتے ہیں کہ افسوس! جو انگلیاں عقدِ گہر کرنے کے لائق تھیں، وہ دانتوں کا رزق ہو گئیں یعنی اہل کمال کو وقفِ حسرت واندوہ کر کے رکھ دیا کہ وہ بہ عالم بے بسی دانتوں سے انگلیاں کاٹیں۔ میرے والد صاحب مرحوم

خدا انھیں غریقِ رحمت کرے گو شاعری کم کرتے تھے لیکن ذوق سلیم ایسا رکھتے تھے کہ ہمیشہ نہ صرف بلحاظ ادب پدری بلکہ بوجہ زور دلائل مجھے ان سے قائل ہونا پڑتا تھا ایک روز کا ذکر ہے کہ میں دیوان غالب پڑھ رہا تھا حضرت بھی اتفاق سے تشریف لے آئے اور میرے ہاتھ سے دیوان لے لیا صفحہ وہی کھلا ہوا تھا جس پر یہ شعر ہے آپ نے پڑھ کر اوّل تو تعریف کی اس کے بعد مجھ سے کہا میاں بتاؤ اس میں غالب نے کوئی غلطی تو نہیں کی ہے میں نے غور کیا اور جب مکرر سوال پر بھی میں خاموش ہی رہا تو فرمایا دیکھو شاعر کا مطلب یہ ہے کہ "فلک نے انگشت کو دانتوں کا رزق کیا" لیکن الفاظ ایسے استعمال کیے ہیں جن سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ خود ان لوگوں کو دانتوں کا رزق کر دیا جن کی انگشت در خور عقدِ گہر تھی میں نے کہا درست ہے۔ تو فرمایا جب تک سیاق بیان سے مطلب نکل آئے شاعر پر اعتراض کرنا نہیں چاہیے کہ وہ بڑی جگر کاوی سے لکھتا ہے اور بے خیالی سے کون غلطی نہیں کرتا اور کس نے غلطی نہیں کی بے عیب ذات صرف اللہ کی ہے۔ آوائے خاک گلاو غمی کیسے پتھر پڑ گئے کہ اب تجھ سے پہلے کے ایسے با کمال لوگ پیدا نہیں ہوتے۔ میں اسی باپ کا کم مایہ بیٹا ہوں اور میرا بیٹا مجھ سے بہت زیادہ نااہل ہے۔

)

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

متاع بردہ مال بہ غارت بردہ۔ حالی نے اس کی شرح یوں کی ہے کہ یہ مضمون بالکل واقعیات میں سے ہے کہ جو لوگ آسودگی کے بعد مفلس ہو جاتے ہیں وہ ہمیشہ اپنے تئیں مظلوم ستم رسیدہ و فلک زدہ سمجھا کرتے ہیں اور اخیر دم تک اس بات کی توقع رکھتے ہیں کہ ضرور

کبھی نہ کبھی ہمارا انصاف ہوگا اور ہمارا اقبال عود کرے گا شرح بالکل درست ہے۔ اس لیے میں صرف وضاحت کے لیے اس شعر کو بدل کر یوں لکھ دینا چاہتا ہوں۔

طلب کرتے ہیں انگلستان سے ہم اپنی آزادی
متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

اسی مضمون کو ذرا انداز بیان بدل کر مصنف نے دوسری جگہ بہت خوبی کے ساتھ لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ (غالب)

گردشِ رنگ طرب سے ڈر ہے
غمِ محرومیِ جاوید نہیں

(۱۰)

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارفؔ
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

مرحوم سے خطاب کرتے کرتے خیال آیا کہ یہ ستم آسمان نے توڑا ہے...... وہ بیچارا اگر کوئی دن اور زندہ رہ کر لطفِ شباب اُٹھاتا تو تیرا کیا بگڑ جاتا۔ عارفؔ مرحوم کا تخلص ہے اور نام زین العابدین خان، یہ مصنف کے شاگرد بھی تھے اور عزیز بھی اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی تو یہ کسی رشتہ سے غالب کے سالے[۸] ہوتے تھے۔ کہتے ہیں کہ خوش گو بھی تھے اور ضرور ہوں گے کہ غالب جیسا شخص ان کے لیے ماتم کرتا ہے لیکن ان کا کوئی شعر میری نظر سے نہیں گزرا۔

(۱۱)

غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ
ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیِ شمع

اے شعلے ترے لرزنے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ شمع کو حسرتِ پروانہ کا غم ہے جس سے وہ ایسی ضعیف و ناتواں ہو گئی ہے کہ تجھے بھی

نہیں سنبھال سکتی۔ یہاں اے شعلہ کا طرزِ بیان اگر اردو سمجھا جائے تو ہائے مختفی، سے غلط ہو گا لیکن اے جس طرح اردو کا لفظ ہے فارسی کا بھی ہے اس لیے جہاں اے شعلہ فارسی کا صحیح طرزِ بیان ہو گا وہاں اردو ہو کر اے شعلہ بھی درست ہو گا کہ ترکیب فارسی موجود ہے میرے اس شعر پر:

(ناطق)

پتہ تو کوچۂ گیسو سے لاتا اب کے چکر میں
وہاں میرا دلِ گم گشتہ بھی اے شانہ آتا ہے

مولانا آسی لکھنوی نے "اے شانہ" کے لیے بھی اعتراض کیا تھا اور میں نے یہی جواب دے دیا لیکن یہ سوچ کر کہ دوسرا کون مجھ سے پوچھنے آئے گا اور میں کس کس کو جواب دے سکوں گا میں نے اپنے شعر کو غزل سے نکال دیا۔

(۱۴)

ترے خیال سے روح اہتزاز ۹ کرتی ہے
بہ جلوہ ریزیِ باد و بہ پرفشانیِ شمع

اہتزاز کرنا بہ عالم سرور وجد میں آنا جھومنے لگنا۔ یہاں روح کے خیالِ یار سے اہتزاز کرنے کو جلوہ ریزیِ باد و پرفشانیِ شمع سے تشبیہ دینا مقصود ہے کہ شعلہ شمع کی زندگی ہوا پر منحصر ہے۔ اگر اس کے ماحول میں ہوا نہ ہو تو شمع بجھ جاتی ہے۔ مصنف نے اس بات کو لفظ قسم سے ادا کیا جس سے لطفِ بیان بہت بڑھ جاتا ہے۔ یہاں "بہ جلوہ" میں بہ قسمیہ [۱۰] ہے۔ کہتے ہیں قسم ہے ہوا کی جلوہ ریزی کی اور قسم ہے پرفشانیِ شمع کی کہ تیری ہوائے خیال سے روح وجد میں آجاتی ہے۔ یہاں دوسرا مصرع پورا فارسی کا ہے اس لیے سب کچھ درست ورنہ اردو میں سوائے واللہ باللہ کے نہ بہ کا برائے قسم استعمال ہے نہ واو کا۔ بلکہ ان

دونوں میں بھی باللہ کو خواص ہی بولتے ہیں البتہ واللہ عام ہے۔

(۱۳)

غالب اپنا بھی عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں

(ناسخ)

شبہ ناسخ نہیں کچھ میرؔ کی استادی میں
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں

مراد میر تقی میر سے ہے جو ہر زمانے اور ہر طبقے میں اردو کے مسلم الثبوت شاعر اور استاد مانے گئے ہیں۔ میرؔ کا خاندان اس وقت گلاؤ ٹھی میں ہی پایا جاتا ہے یہ لوگ جامع مسجد کے عقب میں آباد ہیں مگر یہ پتا نہیں چلتا کہ کب یہ لوگ وہاں آکر آباد ہوئے اور میرؔ سے ان کے اجداد کی کیا نسبت تھی۔

(۱۴)

میں مضطرب ہوں وصل میں خوف رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

پہلا مصرع استفہام انکاری ہے۔ کہتے ہیں وصل میں میرے اضطراب شوق کو دیکھ کر وہم نے تمھیں کس پیچ و تاب میں ڈال دیا۔ جی گھبراتے کیوں ہو میں خوف آمدِ رقیب سے مضطرب نہیں وہ یہاں کیا کھا کر آئے گا۔

(داغ)

اضطراب شوق کا عالم کہوں کیا اس گھڑی
جب کسی کافر کے وا بندِ قبا ہونے لگے

مولانا شوکت میرٹھی نے جہاں غالب کے ساتھ اور بہت سی ناانصافیاں کی ہیں۔ وہاں اس شعر کے متعلق بھی آپ فرماتے ہیں کہ

غالب نے یہ غزل جس مشاعرے میں پڑھی اس میں امام بخش صاحب صہبائی بھی تشریف رکھتے تھے۔ جنھوں نے مشاعرے کے بعد مصنف سے پوچھا کہ "تم نے اس شعر پر کیا معنی پہنائے ہیں" تو غالب نے جواب دیا کہ "مولانا آپ ان باتوں کو کیا جانیں نہ کسی کے عاشق بنے نہ معشوق میں نے تو اس میں اپنا ایک واقعہ نظم کیا ہے کہ ایک خانگی سے مجھے رابطہ ہو گیا تھا اسے کسی بہانے ڈھب پر چڑھایا مگر آمدِ رقیب کے خوف سے شہوت غائب ہو گئی اس نے خیال کیا کہ غالب نامرد ہے میں نے اس کے دفعیہ کے لیے یہ شعر پڑھا۔" بہت ممکن ہے کہ ایسا ہوا ہو اور مصنف نے اپنی حاضر جوابی اور شوخ طبعی کی بنا پر مولانا صہبائی کو یہ جواب دے دیا مگر اس سے شعر پر کوئی آنچ نہیں آتی۔ اس شعر کا یہ زیادہ موزوں مطلب ہو گا کہ معشوق کو وصل میں خوفِ رقیب ہے وہ گھبرا رہا ہے کہ کہیں آ نہ جائے اس کی تسلی کے لیے کہتے ہیں کہ تمھیں اس وہم نے کسی پیچ و تاب میں ڈال رکھا ہے جس سے میں پریشان ہو رہا ہوں (یہاں اس کا گزر کہاں)۔

(۱۵)

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

☆☆☆

زنہار قدم بخاک آہستہ نہی
کیں مردمک چشم نگارے بودست

کہتے ہیں لالہ و گل کی نمائش ان صورتوں کا عکس ہے جو خاک میں پنہاں ہوئی ہیں اور وہ بھی سب نہیں کچھ۔

(ناطق)

فلک یہ چند گل بوٹے جو نکلے بھی تو کیا نکلے

گئی جو خاک میں وہ اچھی صورت پھر نہیں نکلی

(۱۶)

واں وہ غرورِ عزّ و ناز یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

ہمیں پاسِ وضع کی شرم راہ میں ٹوکنے سے روکتی ہے اور انھیں عزت اور ناز کا گھمنڈ بزم میں بلانے سے مانع ہے "جیسے نہ تم خالی نہ ہم خالی" اب سے پہلے شرفا راستے میں کسی کو مل کر ٹوکنے یا سرِ راہ کھڑے ہو کر باتیں کرنے کو معیوب سمجھتے تھے چنانچہ میر تقی میر کا قصہ مشہور ہے کہ جب اُنھوں نے دربار کی کسی بات سے ناراض ہو کر خانہ نشینی اختیار کر لی تھی تو ایک روز شاہ اودھ خود اُنھیں لکھنؤ کے بازار میں گزرتے ہوئے مل گئے بادشاہ نے کچھ گفتگو کرنا اور کشیدہ ہو جانے کی وجہ پوچھنا چاہا تو میر نے یہ جواب دیا کہ راستہ میں باتیں کرنا شرفا کی وضع نہیں۔

(۱۷)

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں

کہا کرتے ہیں کہ آدمی آدمی کے لیے نہیں رویا کرتا بلکہ اپنے آرام کے لیے روتا ہے اور یہ بھی محاورہ ہے کہ "فلاں شخص کے بغیر کون سے کام بند ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ اگر غالب مر گیا ہے تو اس کے لیے کیوں روئیے اور کیوں آہیں بھریے۔ آخر وہ تھا کس کام کا مر گیا جانے دو۔ اگرچہ یہ بات شرح سے متعلق نہیں لیکن دل نہیں مانتا اس لیے لکھے دیتا ہوں کہ گو یہ غزل مرزا غالب کی بہترین غزلوں میں سے ہے لیکن استادی حضرت مرزا داغ دہلوی نے بھی جو اس پر طبع آزمائی کی ہے وہ نہایت ہی قابلِ قدر ہے اور ان کی پوری غزل غالب کی غزل

کے بالکل ہم پلہ ہے کہ اگر اس کے اشعار اس میں شامل کر دیے جائیں تو کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ غالب کے اشعار نہیں۔ مثال کے طور پر مختصراً میں صرف دو شعر لکھے دیتا ہوں۔

عشق و جنوں سے مجھ کو لاگ ہوش و خرد سے اتفاق
پر یہ کہوں تو کیا کہوں میں نے ستم اٹھائے کیوں

جرأتِ شوق پھر کہاں وقت ہی جب نکل گیا
اب تو ہیں یہ ندامتیں صبر کیا تھا ہائے کیوں

کہاں ہیں معترضینِ داغؔ، داغؔ کی اس غزل کو دیکھیں اور بتائیں کہ غالب کے مقابلہ میں یہاں کس بات کی کمی ہے یہ بات اور ہے کہ داغؔ کا رجحان طبع روزمرہ اور محاورات کی طرف تھا جن کے بیان میں انھوں نے ملک سخن پر تنہا حکمرانی کی ہے اور انسانی زندگی کے ہر شعبہ کو اپنی خوش بیانی میں لے لیا ہے۔ داغؔ کے وہاں بازاری اشعار بھی کچھ ہیں لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ بھی وقت اور موقع کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں اور انسانی زندگی کے اس ضروری شعبہ پر بھی حاوی ہو جاتے ہیں۔ داغؔ کے وہاں عالی خیالی کی بھی کمی نہیں مگر معترضینِ داغؔ دوسرے اساتذہ کو بڑھانے کے لیے جو بے انصافیاں داغؔ کے ساتھ کرتے رہے ہیں اسے صرف تنگ نظری کہا جا سکتا ہے مجھے اس معاملہ میں کسی دوسرے معترض کا گلہ نہیں لیکن تعجب ہوتا ہے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ مولانا حسرت موہانی کی جیسی ہستی بھی داغؔ کے محاسن کی طرف سے منھ پھیرے ہوئے ہے اور ان کی خوبیوں کو برائیاں بنا کر پیش کر رہی ہے۔ ثاقب کانپوری نے داغؔ کے ساتھ جو بے انصافیاں کی تھیں ان کا "شہاب ثاقب" لکھ کر میں ایسا

جواب دے چکا ہوں جس کا جواب کافی عرصہ گزر جانے پر بھی اب تک نہیں ہوا لیکن افسوس ہے کہ مولانا حسرت موہانی کا میں احترام کرتا ہوں اور ان کے مقابلہ میں قلم اُٹھانا پسند نہیں کرتا کاش کبھی مجھ سے اور ان سے دوبدو گفتگو کی نوبت آئے۔ آخر میں داغؔ کا ایک شعر اور لکھ کر میں اس بحث کو ختم کرتا ہوں ملاحظہ کیجیے کیا لکھا ہے۔

(داغؔ)

چکر میں مثلِ سنگ فلاخن ہوں دیکھیے
پھینکے مرے نصیب کی گردش کہاں مجھے

(۱۸)

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں مجھ سے مجھے بتا کہ یوں

میرے سوال کے جواب میں جو تم بوسے کا انداز دور سے کلی کو دکھا کر بتاتے ہو اس کی سند نہیں اجی پاس آؤ اور بوسہ لے کر بتاؤ کہ یوں لیا جاتا ہے یا میں تمھارا بوسہ لیتا ہوں لینے دو اور بتاؤ کہ کیا اسی طرح بوسہ لیا جاتا ہے۔ بوسہ کے لین دین کو میں نے ترک کردیا ہے۔

(ناطقؔ)

نہ اپنی شاعری کی دسترس ہے بند محرم تک
نہ آتا ہے ہمیں مضمون ناطقؔ بوسہ بازی کا

مگر اس میں بھی شک نہیں کہ غالب کا یہ شعر ایسا ہے جس پر ان کا منھ بھی چوما جاتا اور ہاتھ بھی۔ اس زمین میں حضرت بیان ویزدانی کا مطلع بھی ملاحظہ کیجیے:

آئے گا حشر کس طرح اس نے بتا دیا کہ یوں
بند قبا کو کھول کر سامنے آ گیا کہ یوں

بیان نے بھی کوئی بات ضرور پیدا کی ہے مگر ان کا مطلع کچھ زیادہ

غیر ثقہ ہے اور اس میں تنافر نیز یہاں کے وہاں اور غالب کے مطلع میں، کچھ کم، ردیف ثانی محل نظر ہے۔ اس میں اپنا مطلع پیش کرتا ہوں۔

(ناطق)

چارہ گروں میں بحث تھی کیجے یوں دوا کہ یوں
میں نے بھی آج کھا کے زہر ان کو بتا دیا کہ یوں

اس پر جو آپ کے جی میں آئے کہہ لیجے مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ ردیف کوئی بے کار نہیں۔

(۱۹)

یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مستِ مےِ ذات چاہیے

عارف حقیقت کو چاہیے کہ مےِ ذات کی جس پیمانہ صفت میں گردش ہو اسی سے مست ہو جائے...... کتب تصوف میں لکھا ہے کہ شیخ محی الدین ابن العربی اندلسی کہا کرتے تھے کہ "تمام عالم بوجود واحد موجود ہے اور اس کی حقیقت ایک ذات واحد کو سمجھو جو کچھ فرق نظر آتا ہے وہ محض اعتباری ہے"۔ ہم عصر علما سے اس پر بحثیں ہوئیں لیکن کوئی پار نہ پاسکا تو آخر ایک روز یار لوگوں نے صلاح کی اور کسی دوست کے وہاں شیخ کی دعوت کی گئی جب آپ ہاتھ دھو چکے تو جہاں اور اصحاب کے لیے اچھی غذائیں چنی گئیں وہاں ان کے سامنے غلاظت کی بھری ہوئی ایک رکابی لا کر رکھ دی گئی شیخ نے میزبان کی طرف سر اٹھا کر دیکھا تو اس نے مسکرا کر کہا "بسم اللہ کیجے۔ سب کھانے بوجود واحد ہیں فرق محض اعتباری ہے اس پر آپ نے چادر سے سر ڈھانک کر جو منھ کھولا تو ایک خنزیر کی شکل نمودار ہوئی اور تمام غلاظت کو صاف کر گئی پھر چادر ڈھانکنے کے بعد جو شیخ نے منھ کھولا تو فرمایا کہ "ہر حیثیت کا

تعلق ایک ہی حیثیت سے نہیں" مگر اس قصے اور غالب کے قطعہ سے عارف کی خصوصیت ہے ماو شما کا یہ مقام نہیں۔

(۲۰)

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

دل کی ساخت الٹی صنوبری ہے۔ کہتے ہیں عجز کے وجود کی دنیا میں مثال صرف ایک ہمارے دل کی بساط تھی مگر وہ بھی کیا ایک خون کا قطرہ اوندھا لٹکا ہوا جو گرنے پر آمادہ ہے۔ یعنی دنیا میں عجز کا وجود اوّل تو ہے ہی نہیں اور اگر ہے بھی تو ایسا کم کہ ختم ہوا چاہتا ہے۔ دورِ حاضر کے ایک مشہور شاعر کے متعلق جن کا نام میں لکھنا نہیں چاہتا مجھ سے اور ایک مشہور ادیب سے گفتگو ہوئی میں نے کہا کہ وہ چور ہے اور ہوشیاری کے ساتھ دوسروں کے خیالات کو اپنے الفاظ میں بدلتا ہے انھوں نے کہا کہ ایسا ہو بھی سکتا ہے میں نے جواب دیا یقیناً تو انھوں نے مجھ سے کہا آپ ہی یہ کام کر کے بتایئے میں نے جواب دیا کہ کسی کی کوئی غزل دے دیجیے اور کوئی زمین بھی دے دیجیے تو میں یہیں بیٹھے بیٹھے لفافے بدل کر انھیں مضامین کو پیش کیے دیتا ہوں انھوں نے غالب کی یہ غزل مجھے دی اور میں نے وہیں تعمیل ارشاد کر دی چنانچہ جو اشعار لکھے گئے وہ پیش کیے دیتا ہوں۔

(ناطق)

بجھ لو اڑ گیا رنگِ وفا گلزارِ عالم سے
یہ کس گنتی میں، مرجھائی ہوئی سی اک کلی دل کی

(غالب)

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

تکلف سے بناوٹی طور پر۔ تکلف بر طرف صاف بات یہ ہے کہ:

(ناسخ)

زہی مصلحت سوجھی ہے دل کو یہ بھی کیا دل ہے
اب ان سے بھی خفا ہے وا رے آشفتگی دل کی

(غالب)

خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے
مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی

صید زبوں بے حقیقت شکار۔ ظاہر ہے کہ پودنا پکڑنے سے شکاری کو تسکین نہیں ہو سکتی۔ کہتے ہیں یہاں بہ عالمِ تمنا موت کا خیال بھی ایسا قوی ہو کر نہیں آتا کہ میرے لیے باعثِ تسکین ہو جائے۔

(ناسخ)

بیانِ وصل پر بس ہو گیا کیا ذکرِ ناکامی
نہیں مرنا بھی بس کی بات غم رے بے بسی دل کی

(غالب)

نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم
کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی

نالہ تو اس خیال سے کیا تھا کہ اس سے کچھ تسکین ہوگی مگر ہوا یہ کہ ناطاقتی نے زور پکڑا اور درد بڑھ گیا۔

(ناسخ)

حقیقت کھل گئی نالہ کی جب دردِ جگر چمکا
بہت چپ چاپ رہا ہے دیکھیے آنکھ اب کھلی دل کی

(غالب)

نہ اتنا برشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ
مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی

مراد دریائے بیتابی جو حسرتوں کا خون ہونے سے پیدا ہوا ہے اس کی ہر موج تمھاری تیغ جفا کی روانی دکھاتی ہے یعنی تمھیں جس تیغ جفا پر ناز ہے ایسی ہزاروں تلواریں مرے دل پر چل رہی ہیں۔

(ناطق)

بنی تیغِ جفا ہر موج اس دریائے احمر سے
کیا خوں اس نے دل کا خون جو حسرت ہوئی دل کی

"فرماؤ" کا استعمال اب درست نہیں یا تو "کہو کہا جائے گا" یا "فرمائیے"۔

(غالب)

ہے بِ عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

ایک دو چار سات آسماں۔ آسمان اوندھے پیالہ سے مشابہ ہے جس میخانہ میں صرف چند اوندھے پیالے پڑے ہوں وہاں کے ساقی سے شراب کی توقع لاحاصل۔

(ناطق)

خیال ساغرِ خالی بھی سامانِ تکلف ہے
تکلف بر طرف دیکھو ذرا یہ سادگی دل کی

(۲۱)

درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

اس غزل کے تین اشعار رنگ تغزل سے جدا ہیں جس سے یہ پتا چلتا ہے کہ پوری غزل کی غزل مرگ معشوق پر بطور مرثیہ لکھی گئی جسے ان کی ہمدردی نے ختم کر دیا ہے اس لیے تمام اشعار کی تشریح اس انداز سے کی جاتی ہے اس غزل کو اگر مومن خان کے مرثیہ کی طرح

بیان واقعہ سمجھا جائے تو غلط ہوگا کیوں کہ غالب نے عمر بھر ایسے جھگڑے نہیں پالے یہ رعیہ بے نواز و سخن پرست نہ کبھی شاہد پرستی کا مرتکب [۱۳] ہوا نہ کبھی آوارہ گردی کی مولانا شوکت میرٹھی نے:

"میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں"

کے متعلق جو قصہ لکھا ہے اس کا کسی اور واسطے سے پتا نہیں چلتا اس لیے ہمیں اوّل تو اس کی صداقت ہی میں شک ہے لیکن اگر سچ بھی ہو تو یہ محض غالب کی حاضر جوابی کا بدرجہ "کمال ثبوت ہونے میں پیش کیا جا سکتا ہے کیوں کہ جب مولوی امام بخش صاحب صہبائی جیسا فاضل اور قادر الکلام سخن فہم بزرگ ایک ایسے صاف شعر کے لیے یہ سوال کر بیٹھے کہ "مرزا نوشہ تم نے اس پر کیا معنی پہنائے ہیں" تو اس کا یہی بہترین جواب ہو سکتا ہے جو دے دیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی غم زدہ کی فرمائش پر چند اشعار اپنی زبان میں لکھ دیے گئے یا جو اشعار انھوں نے مرگ عارف کے سلسلے میں لکھے ممکن ہے کہ انھیں کی باقی کڑیاں یہ بھی ہوں۔ [۱۴]

(۲۲)

ہم سے رنجِ بیتابی کس طرح اُٹھایا جائے
داغ پشتِ دستِ عجز شعلہ خس بہ دنداں ہے

داغ مصنف کے خیال کے مطابق دھوئیں سے پیدا ہوتا ہے جس کے متعلق لکھ آئے ہیں:

(غالب)

آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

یعنی جب داغ دھوئیں سے بنا اور دھواں پریشان ہوتا ہے تو داغ پریشانیوں

کا مجموعہ ہو گیا جسے بیاضِ بھی کہتے ہیں۔ خس بہ دنداں ہونا اظہار عجز کی قدیم رسم ہے۔ جس کے متعلق لکھ آئے ہیں:

(غالب)

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو

لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

...... مصنف نے اس کا مطلب یوں بیان کیا کہ "پشتِ دستِ عجز اور خس بہ دنداں گرفتن بھی اظہار عجز ہے پس جس عالم میں کہ داغ نے پشت زمین پر رکھ دی ہو اور شعلہ نے تنکا دبا لیا ہو ہم سے رنج و اضطراب کا تحمل کس طرح ہو۔ مصنف نے اپنے ایک خط میں ان اشعار کے متعلق یہ لکھا ہے کہ "یہ اس دیوان کا بقیہ نمونہ ہے جو تمیز آنے کے بعد خود مصنف نے دور کیا اور سب شعر یک قلم چاک کر ڈالے" غالب کی اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد انھیں ایسے اشعار کی نسبت اپنی طرف منظور نہیں رہی مگر بد قسمتی سے جب زمانے نے غالب پرستی اختیار کی تو ان کے اس کلام کی بھی تلاش ہوئی جسے مرزا نے اپنے الفاظ میں دور کیا تھا اور ان کے یہ الفاظ "جب تمیز آئی" صاف بتا رہے ہیں کہ انھوں نے اس کلام کو ایک طوفانِ بے تمیزی سمجھا تھا۔ ہوتا یہ ہے کہ شاعر زمانۂ مشق میں اوّل سے آخر تک اپنے اشعار کو پیش کرتا رہتا ہے جس کی نقلیں بھی لوگوں کے پاس موجود ہوتی ہیں چنانچہ جو نسخہ یا بندہ غالب کے پہلے والے مجموعہ کی ایک نقل نواب حمید اللہ خاں صاحب فرماں روائے بھوپال کو اپنے زمانۂ ولی عہدی میں ریاست کے کتب خانے کے اندر مل گئی اور ایک نسخہ مولانا عبدالباری صاحب آسی کے ہاتھ آیا[۱۵] جو دونوں کے دونوں

چھپ چکے ہیں بلکہ مولانا آسی نے تو اس کی شرح بھی کی ہے میرے نزدیک یہ سب کلام غالب سے منسوب بھی کیا جا سکتا ہے اور نہیں

بھی اس طرح کہ اس کی خوبیوں کی داد ضرور انھیں دی جا سکتی ہے لیکن عیوب کے وہ ذمہ دار نہیں کہ خود اسے اپنے کلام سے علاحدہ کر چکے تھے۔ غالب کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ آپ مشق سخن کی ابتدا میں کچھ غزلیں میر تقی میر کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئے تھے جنھیں دیکھ کر اُنھوں نے کہہ دیا کہ اگر اس لڑکے کو کوئی اچھا استاد مل گیا تو بڑا اچھا شاعر ہوگا ورنہ مہمل بکنے لگے گا مگر چوں کہ خود میر نے اُنھیں اصلاح نہیں دی اس لیے غالب چندے مغلقات ہی لکھتے رہے جنھیں مہمل گوئی کہیے یا کچھ اس کے بعد جو لوگوں کے اعتراضات پر خیال کیا تو یہ لکھا۔

(غالب)

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سُن سُن کے اسے سخن ورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل

پھر سنبھلے تو وہ کچھ لکھا کہ دنیائے شاعری میں سکہ جما لیا اور آسان بھی لکھا تو ایسا کہ بہت سے اشعار سہل ممتنع ہو کر اردو کے روزمرہ میں شامل ہو گئے ہیں اور روزانہ گفتگو میں کثرت سے پڑھے جاتے ہیں۔

(۲۳)

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منھ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

سقیم الحال کی اطلاع پا کر جب وہ دیکھنے کو آتے ہیں تو اُنھیں دیکھ کر میرے منھ پر رونق آجاتی ہے چہرہ پر رونق دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ اس کا حال اچھا ہے بیمار نہیں۔ مصنف کا یہ شعر بے حد مقبول ہے مجھ سے منشی ممتاز علی صاحب آہ امیٹھوی نے جو امیر مینائی کے ارشد تلامذہ

میں سے تھے اور جو دفتر امیر اللغات کے پہلے سکریٹری بھی تھے بیان کیا کہ اس زمین میں جب امیر مینائی نے غزل لکھی ہے تو آپ بتاتے جاتے تھے اور میں لکھتا جاتا تھا جب حال کے قافیہ پر آئے تو کئی شعر لکھائے لکھاتے تھے اور پھر اسی پر فکر کرتے تھے میں نے کہا کہ حضرت اب تو اس میں کئی شعر نکل آئے اور خوب خوب ہو گئے مزید فکر کی ضرورت نہیں اس پر انھوں نے زانو پر ہاتھ مارا اور یہی شعر پڑھا۔ دیگر اساتذہ نے بھی اس قافیہ پر بہت زور لگایا ہے۔ حضرت داغ مرحوم کا شعر بھی سہل ممتنع اور بیت الغزل ہے۔

(داغ)

آپ گھبرائیں نہیں جور سے توبہ نہ کریں
آپ پچھتائیں نہیں داغ کا حال اچھا ہے
وہ عیادت کے لیے آئے ہیں لو اور سنو
آج ہی خوبیِ تقدیر سے حال اچھا[۱۶] ہے

"ان کے دیکھے سے" جو یہاں مصنف نے لکھا ہے اور جس سے مطلب ان کو دیکھنے سے ہے اب اس طرح نہیں بولا جاتا یہ لفظ اب خود ان کے دیکھنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

(۲۴)

میں جو گستاخ ہوں آئین غزل خوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے

مگر اس کا سبب یہ ہے کہ تیرا خیال کرم میرے ذوق کو بڑھا دیتا ہے۔

(غالب)

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

(۲۵)

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

میری آج کی تلخ نوائی کا سبب درد دل کی زیادتی ہے غالب تمھیں اس سے تکلیف ہوئی ہو تو معاف کرنا۔ غزل کے باقی اشعار کو تلخ نوائی سے کوئی واسطہ نہیں بلکہ یہاں مدح سرائی بھی ہے اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا اشارہ کس طرف ہے۔ جواب یہ ہے کہ غزل کا ہر شعر آزاد ہوتا ہے جو حسب موقع استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ مقطع اور اوپر کا شعر حضرت ذوق اور بادشاہ پر چوٹ ہے۔ مطلب یہ کہ تیرا وہ کرم جس نے ذوق کو بڑھا دیا آئین غزل خوانی میں میرے گستاخ ہونے کا سبب ہے کیوں کہ مجھے تیری سخن نا فہمی کا یقین ہو گیا اور مقطع کی تلخ نوائی میں بھی اس کا بیان ہے۔ درد سوا ہوتا ہے کا یہ مطلب ہے کہ آج کچھ زیادہ جی دکھا ہوا ہے۔ اس پر صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ یار لوگوں نے لفظ ذوق سے اپنی بدذوقی کا ثبوت دیا۔

(۳۶)

...... پوچھ مت وجہ سیہ مستیِ ارباب چمن
سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موج شراب
ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر
موج ہستی کو کرے فیض ہوا موج شراب

ایک مرتبہ جناب جگر مرادآبادی ناگپور تشریف لے آئے لوگوں نے مجھے مجبور کیا کہ چل کر ان سے مل لیجیے احباب کے خوش کرنے کے لیے جانا پڑا دیکھا کہ لوگ گھیرے ہوئے ہیں اور جگر صاحب بے تکلفی سے مے نوشی میں مشغول ہیں مکان میں ہوا کا گزر نہ تھا اور میں ایک عرصے سے اختلاج کا مریض ہوں بہت کوشش کی کہ لوگ ہٹ

جائیں لیکن جو موجود تھے وہ تو نہ ٹلے اور بھی بہت سے آگئے کہ دیکھیں باہم کیا گفتگو ہوتی ہے مجھے اس سے تکلیف ہونے لگی اور تنفس بڑھ گیا تو میں نے کہا کہ بھائی خدا کے لیے یا ہوا آنے دو یا مجھے جانے دو۔ اس پر جگر صاحب نے اپنے نمبر ۲ پلانے والے ساقی سے فرمایا کہ "انھیں ہوا چاہیے اور مجھے شراب" میں اُٹھا اور غالب کا یہی شعر پڑھ کر چلا آیا۔

(ناطق)

رات بے خودی ہے اہلِ ہوش کے لیے (کذا)
مست اس کو کیا جانیں کس گلی میں بستی ہے

(۴۷)

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

تو کیسے کیسے رعنائی اور دلربائی کے انداز مجھے دکھاتا ہے ان سے سمجھ جا کہ فراق میں تیری یاد بایں ہمہ دلجوئی مجھ پر کیا ستم ڈھاتی ہوگی۔ یا یہ کہ جب تیرے رہتے ہوئے بھی بے قراری کا یہ عالم ہے کہ تو بھی اس سے متاثر ہوتا ہے تو فراق میں میرا کیا حال ہوتا ہوگا۔ یہاں یہ مطلب نہیں نکالا جاسکتا ہے کہ تو مجھے دیکھ کر متوحش ہوتا ہے کیوں کہ حال پرسی اس کے منافی ہے۔ پہلے مصرع کے طرز کلام میں اب "کیا حال ہے" بولنا درست نہ سمجھا جائے گا اس کی جگہ "کیا حال ہوتا ہے یار ہتا ہے" کہیں گے۔ اس طرز خطاب سے فائدہ اُٹھا کر میرے ایک مرحوم ہم وطن منشی شمس الحق صاحب خیالؔ جن کی عمر کا بیشتر حصہ رام پور میں گزرا تھا مجھ سے کہنے لگے کہ غالب کے اس شعر میں دم کا بدترین پہلو نکلتا ہے میں نے کہا "ہوگا" "ہر کس بہ خیال خویش خبطے دارد" آخر غالب سے نواب یوسف علی خاں مشورہ فرماتے ہی تھے اور

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

میری آج کی تلخ نوائی کا سبب درد دل کی زیادتی ہے غالب تمھیں اس سے تکلیف ہوئی ہو تو معاف کرنا۔ غزل کے باقی اشعار کو تلخ نوائی سے کوئی واسطہ نہیں بلکہ یہاں مدح سرائی بھی ہے اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا اشارہ کس طرف ہے۔ جواب یہ ہے کہ غزل کا ہر شعر آزاد ہوتا ہے جو حسب موقع استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ مقطع اور اوپر کا شعر حضرت ذوق اور بادشاہ پر چوٹ ہے۔ مطلب یہ کہ تیرا وہ کرم جس نے ذوق کو بڑھا دیا آئین غزل خوانی میں میرے گستاخ ہونے کا سبب ہے کیوں کہ مجھے تیری سخن نا فہمی کا یقین ہو گیا اور مقطع کی تلخ نوائی میں بھی اس کا بیان ہے۔ درد سوا ہوتا ہے کا یہ مطلب ہے کہ آج کچھ زیادہ جی دکھا ہوا ہے۔ اس پر صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ یار لوگوں نے لفظ ذوق سے اپنی بدذوقی کا ثبوت دیا۔

(۳۶)

...... پوچھ مت وجہ سیہ مستیِ ارباب چمن
سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موج شراب
ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر
موج ہستی کو کرے فیض ہوا موج شراب

ایک مرتبہ جناب جگر مرادآبادی ناگپور تشریف لے آئے لوگوں نے مجھے مجبور کیا کہ چل کر ان سے مل لیجیے احباب کے خوش کرنے کے لیے جانا پڑا دیکھا کہ لوگ گھیرے ہوئے ہیں اور جگر صاحب بے تکلفی سے مے نوشی میں مشغول ہیں مکان میں ہوا کا گزر نہ تھا اور میں ایک عرصے سے اختلاج کا مریض ہوں بہت کوشش کی کہ لوگ ہٹ

جائیں لیکن جو موجود تھے وہ تو نہ ملے اور بھی بہت سے آگئے کہ دیکھیں باہم کیا گفتگو ہوتی ہے مجھے اس سے تکلیف ہونے لگی اور تنفس بڑھ گیا تو میں نے کہا کہ بھائی خدا کے لیے یا ہوا آنے دو یا مجھے جانے دو۔اس پر جگر صاحب نے اپنے نمبر ۲ پلانے والے ساقی سے فرمایا کہ "انھیں ہوا چاہیے اور مجھے شراب" میں اُٹھا اور غالب کا یہی شعر پڑھ کر چلا آیا۔

(تالق)

رازِ بے خودی ہے اہلِ ہوش کے لیے (کذا)
مست اس کو کیا جانیں کس گلی میں بستی ہے

(۴۷)

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

تو کیسے کیسے رعنائی اور دلربائی کے انداز مجھے دکھاتا ہے ان سے سمجھ جا کہ فراق میں تیری یاد بایں ہمہ دلجوئی مجھ پر کیا ستم ڈھاتی ہوگی۔یا یہ کہ جب تیرے رہتے ہوئے بھی بے قراری کا یہ عالم ہے کہ تو بھی اس سے متاثر ہوتا ہے تو فراق میں میرا کیا حال ہوتا ہوگا۔یہاں یہ مطلب نہیں نکالا جاسکتا ہے کہ تو مجھے دیکھ کر متوحش ہوتا ہے کیوں کہ حال پرسی اس کے منافی ہے۔ پہلے مصرع کے طرز کلام میں اب "کیا حال ہے" بولنا درست نہ سمجھا جائے گا اس کی جگہ "کیا حال ہوتا ہے یا رہتا ہے" کہیں گے۔ اس طرز خطاب سے فائدہ اُٹھا کر میرے ایک مرحوم ہم وطن منشی شمس الحق صاحب خیال جن کی عمر کا بیشتر حصہ رام پور میں گزرا تھا مجھ سے کہنے لگے کہ غالب کے اس شعر میں دم کا بدترین پہلو نکلتا ہے میں نے کہا "ہوگا" "ہر کس بہ خیال خویش خبطے دارد" آخر غالب سے نواب یوسف علی خاں مشورہ فرماتے ہی تھے اور

ان کا رام پور میں جانا آنا تھا ہی۔

(۴۸)

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے؟
غلامِ ساقیِ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے؟

ساقی کوثر پیغمبر اسلام جو حوض کوثر پر ساقی ہوں گے۔ مصنف اعتقاداً شیعہ نہیں تو تفضیلیہ ضرور تھے اہل تشیع کا یہ اعتقاد ہے کہ ساقی کوثر حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہوں گے چوں کہ غالب نے پیغمبر اسلام کی نسبت حضرت علیؑ کی طرف زیادہ رجحان عقیدت کا اظہار کیا ہے مثلاً۔

مشکیں لباسِ کعبہ علی کے قدم سے جان
نافِ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے

اس لیے میرا خیال ہے کہ یہاں ساقی کوثر سے مصنف کی مراد حضرت علیؑ ہیں پیغمبر اسلام نہیں۔ شراب غم غلط کرنے کا ذریعہ ہے۔ گیتی زمین جس سے یہاں مراد ہے عالم۔ کہتے ہیں غمِ دنیا اگر بہت ہے تو اسے مٹانے کے لیے شراب کی بھی تو افراط ہے کیوں کہ میں ساقی کوثر کا غلام یعنی ان کے بادۂ شوق میں سرمست ہوں مجھے کس بات کا غم ہو سکتا ہے۔

(۴۹)

ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جامِ جم نکلے

جمشید کی بادہ آشامی اس کے عالی مرتبت بادشاہ ہونے کی وجہ سے جامِ جہاں نما کی ایجاد کا باعث ہوئی جو جمشید کے بعد نابود ہو گیا کیوں کہ کسی میں اس کی قابلیت نہ تھی اب چوں کہ مجھ سا عالی ظرف بادہ نوش پیدا ہوا ہے اس لیے پھر وہ زمانہ آگیا کہ جامِ جہاں نما کا استعمال

ہو بعض لوگ غالب کا نسب بھی جمشید سے وابستہ بتاتے ہیں اور ثبوت میں ان کا یہ شعر پیش کرتے ہیں:

درمن ہوسِ بادہ طبیعت کہ غالب
پیمانہ بہ جمشید رساند نسبم را

غالب مغل تھے اور بمبئی میں مسلم ایرانیوں کو مغل کہتے ہیں۔

(۳۰)

تکلف برطرف ہے جاں ستاں تر لطف بد خویاں
نگاہِ بے حجابِ ناز تیغ تیز عریاں ہے

صاف بات ہے کہ معشوقانِ بدخو کی نمائشی مہربانی اور بھی زیادہ جان لیوا ہے کہ ان کی نگاہِ ناز بہ عالم بے حجابی تنگی اور تیز تلوار کا کام کرتی ہے۔

(غالب)

کرنے گئے تھے ان سے تغافل کا ہم گلا
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

(امیر مینائی)

شرم کو آپ کی اللہ سلامت رکھے
شوخیوں نے تو مجھے مار ہی ڈالا ہوتا

حضرت امیر کا شعر نہایت بے تکلفانہ اور خوب ہے لیکن "اللہ سلامت رکھے" شرفا کی زبان نہیں وہ ایسے موقع پر "خدا عمر دراز کرے" کہتے ہیں۔

(آتش)

اسی کے سایہ میں ہوتی ہے میرے دل کی بسر
خدا دراز کرے عمر زلفِ پیچاں کی

اکثر الفاظ کا محل استعمال ایسا ہوتا ہے کہ اس میں عام و خاص کے

محاورے کے مطابق فرق لازم ہے حضرت اُستاد کے مندرجہ ذیل شعر میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

(داغ)

سخن شاہ و گدا خیر سے خالی نہ سنا
یہ دعا کرتے ہیں سب کو وہ دعا کہتے ہیں

مطلب یہ کہ لفظ "دعا" اگر شاہی استعمال میں آئے تو کہیں گے کہ "جہاں پناہ دعا کہتے ہیں" اور اگر فقیروں کی زبان میں آئے گا تو بولیں گے کہ جان و مال کو دعا کرتے ہیں۔

(۳۱)

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزمِ چراغاں کیے ہوئے

آبِ آتشیں کو چراغ سے تعبیر کیا۔ کہتے ہیں بہت دنوں سے ہماری بزم کو جوشِ قدح سے چراغاں ہونے کی نوبت نہیں آئی اور ہوتی بھی کہاں سے یار ہی مہمان نہیں ہوا جس کے ساتھ لطفِ مے نوشی ہے اور جس کی تابِ رخ سے نور ساغر ہوتا ہے۔ میری ایک غزل اس زمین میں موجود ہے جو ایک دوست کی فرمائش پر مصنف کے قوافیہ میں لکھی گئی تھی جس کے بعض اشعار جو یاد آئے نقل کیے جاتے ہیں۔

(ناطق)

بیٹھا ہوں برقِ طور کو مہماں کیے ہوئے
ذرّوں کو دستِ غم کے چراغاں کیے ہوئے

(۳۲)

پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے

دم رکنا سانس گھٹنا گھبرانا اُلجھن ہونا پریشان ہونا۔ کہتے ہیں چاک گریباں کی بہار دیکھتے ہوئے مدت ہو گئی اس لیے وضع احتیاط سے جو اس سے بغض رکھتی ہے پھر دم رُکنے لگا ہے اب مجھے مجبور ہو کر گریباں دری کرنی پڑی۔

(ناطق)

دیوانہ وار چرخ ہے گرداں بہ کوئے ناز
نورِ سحر سے چاک گریباں کیے ہوئے

(۳۳)

پھر گرم نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے

دل چاہتا ہے کہ نالہ شرربار کی جو سیر دیکھ چکے ہیں جس سے ہر طرف آگ لگ گئی تھی اُسے پھر دیکھیں اس لیے نفس پھر سرگرم نالہ ہائے شرربار ہے۔

(ناطق)

ہے تابِ حسن باعثِ سوزِ دل و جگر
یہ گھر میں آپ ہی کے چراغاں کیے ہوئے

(۳۴)

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

حضرت عشق بھرپورے سامان کے ساتھ زخمِ دل کی مزاج پرسی کو تشریف لا رہے ہیں۔ سامانِ صد ہزار نمکداں یعنی ذوقِ حسنِ ملیح۔

(ناطق)

مہمانِ غم ہوں ذوق ہے حسنِ ملیح کا
بیٹھا ہوں زخمِ دل کو نمکداں کیے ہوئے

(۳۵)

بھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بہ خون دل
سازِ چمن طرازیِ داماں کیے ہوئے

پھر دامن پر گل بوٹے بنانے کا ارادہ ہے اس لیے اپنے خامۂ مژگاں کو خونِ دل کی سیاہی سے بھر رہا ہوں اب دیکھنا اس کی تراوش سے کیسی کیسی گلکاریاں ہوتی ہیں۔

(ناطق)

کس شان سے چلی ہے براتِ جنونِ عشق
دامن کو جیب، جیب کو داماں کیے ہوئے

(۳۶)

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے

دل کو اُسے آغوشِ تصور میں لینے کا خیال ہے اور آنکھ کو آغوشِ نظارہ میں لینے کا، اس سامان سے دونوں میں پھر رقابت کی صورت پیدا ہو گئی اس خیال کو مصنف نے بار بار باندھا ہے چنانچہ ایک شعر یہ ہے۔

(غالب)

نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

(ناطق)

ہے ہر نفس یہاں دمِ شمشیر کا جواب
جیتے بھی ہیں تو موت کا ساماں کیے ہوئے

(۳۷)

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب

عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

پھر سودائے عشق سوار ہوا ہے اور بازارِ محبت میں اس سامان کی دوکان لگا کر بیٹھے ہیں جسے عقل دل اور جان کہتے ہیں کہ کوئی اہلِ ناز و غمزہ ان کی قیمت لگانے کے لیے خریدار مل جائے تو دام کھرے کرلیں۔

(نا طق)

اللہ رے ذوقِ لذتِ غم جس کے فیض سے
رکھتے ہیں جان و دل کو دل و جاں کیے ہوئے

(۳۸)

اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

نگاہ ایک نوبہارِ ناز کی تاک میں ہے کہ پھر کسی طرح بہارِ نظارہ کی رُت آئے اور وہ سرورِ مے سے باغ باغ دکھائی دے۔

(نا طق)

محوِ نظارہ دیدۂ نرگس سے ہے بہار
ہر گل کو نوبہار گلستاں کیے ہوئے

(۳۹)

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

پھر جی چاہتا ہے کہ معشوق کے دروازہ پڑے رہیں اور اب کے ایسا شوق دامن گیر ہے کہ درباں کا احسان اُٹھانا جو پہلے عار تھا، وہ بھی منظور ہے۔

(نا طق)

ہے تم کو گھر پہ ناز مصیبت کی بات ہے
جا داوِ بدمزاجیِ درباں کیے ہوئے

(۳۰)

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے[18] رات دن

بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

دل پہلے کی فرصت کو ڈھونڈتا ہے کہ جب تصورِ جاناں میں بیٹھنے کا لطف تھا۔ یا یہ کہ ان فرصت کے شب و روز کو جو میسر نہیں دل پھر ڈھونڈتا ہے جب تصورِ یار میں بیٹھے رہتے تھے۔ بڑا اچھا شعر ہے، بہت مشہور ہے اور ایک مبتذل قافیہ کو بڑے کمال سے نظم کیا ہے۔

(ناطق)

تصدیق ہے یہ خلوتِ آئینہ خامشی

تصویر ہے تصورِ جاناں کیے ہوئے

(۳۱)

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر

نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

اے حضرت خضر ایک ہماری چند روزہ زندگی ہے کہ ہم لوگوں سے روشناس ہوتے ہوئے ہنس بول کر اس کا لطف اُٹھاتے ہیں اور ایک تمھاری حیاتِ جاوید کہ تمھیں کسی سے ملنے کی بھی چوری ہو گئی۔

(ناطق)

پھرے جاؤ خضر تم منہ چھپائے رہتی دنیا تک

جیو اور لطفِ عمرِ جاودانی دیکھتے جاؤ[19]

لفظ خضر "بکسر خا و سکونِ ض" بھی درست ہے اور "بہ فتح ض" بھی یہ اردو کا استعمال ہے لیکن عربی میں اس کا صحیح لفظ "بہ فتح خا و کسر ض" ہے۔

حواشی

(۱) فروری ۱۹۶۸ء میں۔

(۲) اس خط و کتابت (کل خط ۴) کی نقل جناب محمد عبدالکلیم ناگپوری صاحب نے مجھے فراہم کی تھی۔

(۳) فرہنگِ آنند راج (بحوالہ بہارِ عجم) میں اس شعر کو کمال اسمٰعیل کی تصنیف کہا گیا ہے۔

(۴) ۔ نقش فریادی ہے کس کی...... الخ یہ شعر غالب نے ۱۸۱۶ء یا اس سے پہلے فکر کیا تھا۔

غالب نے یہ تلمیح دوسرے اردو اشعار میں بھی استعمال کی ہے ایک تو اسی شعر میں جو ناطق مرحوم نے درج کیا ہے (فکر کردہ ۱۸۲۱ء) دوسرے دو شعر یہ ہیں:

پہنے ہے پیرہنِ کاغذِ ابری ، نیساں
یہ تنک مایہ ہے فریادیِ جوشِ ایثار
(۱۸۲۱ء)

☆☆☆

داد خواہِ تپش و مُہرِ خموشی برلب
کاغذِ سرمہ ہے جامہ ترے بیماروں کا
(۱۸۱۶ء)

(۵) جناب ناطق مرحوم کی دی ہوئی فارسی شعر کی سند کے علاوہ اہلِ ایران کے کلام میں اس رسم کی تلمیح کئی اشعار میں استعمال کی گئی ہے۔ بہارِ عجم اور فرہنگِ آنند راج میں یہ اشعار درج ہیں:

زخوباں دادِ خواہم فغانی! مہربانے کو
کہ سازد کاغذیں پیراہن از طومار افسوں ہم
(بابا فغانی)

تاکہ دستِ قدرِ ا ز دستِ تو بربود قلم
کاغذیں پیرہن از دستِ قدر باد بدر
(خاقانی)

کاغذیں جامہ چو صبح آہی بر آرم ہر شبی
تا کجا خواہد رسیدن زیں تظلم کارِ من
(سیف الدین اسفرنگی)

(۶) اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے جناب ناطق نے لفظ "پرے" کے استعمال پر دلچسپ بحث کی ہے۔ یہاں صرف اسی سے متعلق سواد درج کیا جا رہا ہے۔

(۷) لارڈ کچنر (۱۸۵۰ء تا ۱۹۱۶ء) یہ بہادر انگریز اپنے ہمپ شائر (H.M.S.Hampshire) نامی جہاز کے ساتھ ہی غرقاب ہو گیا تھا جب کہ وہ کسی خاص مشن پر روس جا رہا تھا۔

(۸) عارف، غالب کے سالے نہیں بلکہ ان کی سالی بنیادی بیگم کے فرزند تھے۔ عارف کا کلام تا حال نہیں چھپا مگر اس کے دیوان کے کئی قلمی نسخے دستیاب ہیں۔ چند تذکروں اور دوسری کتابوں میں بھی چند اشعار دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔

(۹) صحیح لفظ احتراز ہے۔ معتبر نسخوں میں بھی اہتراز اور احتراز دونوں طرح لکھا ملتا ہے مگر دونوں غلط ہیں۔

(۱۰) یہ قسمیہ حقیقت میں ب قسمیہ ہے۔ مصرع کو: "بجلوہ ریزیِ بادو بپر فشانیِ شمع" پڑھنا چاہیے۔ ب قسمیہ کا استعمال اردو میں بھی ہے مگر کم جیسے: وہ بھی ہے ذوالفقار کی زد میں بمرتضےٰ (یعنی علی مرتضےٰ کی قسم) یا انیس کا شعر:

یہ مرض وہ ہے کہ دنیا میں نہیں جس کی دوا
یہ ہے وہ زخم کہ مرہم نہیں جس کا بخدا
(یعنی خدا کی قسم)

(۱۱) یہ مضمون نیا نہیں مگر غالب نے اسے بہترین صورت عطا کی ہے۔

(۱۲) یہ شعر کسی رباعی کا معلوم ہوتا ہے مگر خبر نہیں کس کا ہے، تاہم عمر خیام کی ایک رباعی بھی اس مضمون کی ہے:

در ہر دشتے کہ لالہ زارے بودست — آں لالہ زخونِ شہریارے بودست
ہر برگِ بنفشہ کز زمیں می روید — خالے ست کہ بر روئے نگارے بودست

اس مضمون کے اور بھی کئی شعر پیش نظر ہیں ملاحظہ فرمائیں:

خسرو:

اے گل چو آمدی ز زمیں گو چگونہ اند — آں روے ہا کہ در تہِ گرد فنا شدند

بیدلؔ:

خلقے بہ عدم دود و عدم و داغ جگر بُرد — خاک ہمہ صرف گل و سنبل شدہ باشد

میرؔ:

ہیں مستحیل خاک سے اجزائے نوخطاں — کیا سہل ہے زمین سے کھلنا نبات کا

ہر قطعۂ چمن، پہ ٹک گاڑ کر نظر کر — بگڑیں ہزار شکلیں تب پھول یہ بنائے

کو گل و لالہ کہاں سنبل سمن ہم نسترن — خاک سے یکساں ہوئے ہیں ہائے کیا کیا آشنا

سوداؔ:

گئے جہان سے کیا کیا ستیزہ رُو تہِ خاک — کہ گل عدم سے جو آیا بہت فگار آیا

ناسخؔ:

ہو گئے دفن ہزاروں ہی گل اندام اس میں — اس لیے خاک سے ہوتے ہیں گلستاں پیدا

منسوب بہ ناسخؔ:

باغ میں گلبن ہیں گلدستے مرزاوں کے تمام — خاک میں کیا کیا ہی گل رخسار پنہاں ہو گئے

مرزا ودیعہ بیگ کاملؔ تلمیذ سوداؔ:

ہزاروں غنچہ دہن ہیں جو باغ میں پنہاں — شگفتہ گویا ہوا گلستاں زمیں کے تلے

حاتم علی بیگ مہرؔ:

ملے ہیں خاک میں گل رُو ہزاروں — عجب گلزار اک زیرِ زمیں ہے

نظیرؔ:

تھے کل یہ خطِ عارضِ خوبانِ سبز رنگ — کہتی ہے آج خلق جنھیں سبزہ زار رہا

جنابِ ناطقؔ مرحوم کا اس مضمون کا شعر صفحہ ۲۷ پر ملاحظہ کیجیے۔ تفننِ طبع کے لیے راقم بھی ایک پرانی غزل کا یہ شعر پیش کرنے کی جسارت کرتا ہے:

وہی جمال، وہی رنگ، تمکنت بھی وہی

یہ پھول نکلے زمیں سے کہ نازنیں نکلے

(۱۳) یہ درست نہیں۔

(۱۴) ان اشعار پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ان کا مرگِ عارف سے کوئی تعلق نہیں۔

(۱۵) اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ کلام جعلی ہے اور خود آسی مرحوم کے دماغ کی اُپج ہے۔

(۱۶) "حال اچھا ہے" یعنی مرض میں کچھ افاقہ ہے یا طبیعت کو کچھ سکون ہے۔ "حال اچھا ہے" اپنی جگہ پر مکمل ٹکڑا ہے۔ "حال اچھا ہونا" کو اس کا ماخذ سمجھ کر کسی اور طرح سے اس کا استعمال مستحسن نہ ہوگا۔

(۱۷) لیکن آتش نے یہ بھی تو کہا ہے:

ساقیا جام کو "اللہ سلامت رکھے"
یہ قدح میرا ہے خیر اس کی مناتا ہوں میں

غالباً جناب ناطق مرحوم کی یہ رائے ہے کہ شاعر کو: شرم کو آپ کی اللہ سلامت رکھے کے بجائے کچھ ایسا مصرع فکر کرنا چاہیے تھا۔ آپ کی شرم کی اللہ کرے عمر دراز، لیکن آتش کے مصرع میں "زلف پیچاں" سے "دراز" کا لفظ مناسبت رکھتا ہے مگر "شرم" سے "دراز" کو کوئی مناسبت نہیں ہے۔

(۱۸) اس شعر کا پہلا مصرع یوں ہے:

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن

یعنی دل پھر وہی پہلی سی فرصت ڈھونڈتا ہے تاکہ پہلے کی طرح رات دن تصورِ جاناں کیے ہوئے بیٹھے رہیں۔ اردو کے اچھے اچھے دانش وروں کو بھی اس شعر کو غلط لکھتے پڑھتے اور بولتے دیکھا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلے مصرع کا "کہ رات دن" دوسرے مصرع کا حصہ ہے۔

(۱۹) غالب کے اس مشہور شعر کے ہوتے ہوئے جناب ناطق کا شعر بھی لطف سے خالی نہیں۔

پنج آہنگ کے چند اہم نسخے

میرے غالب کلکشن میں غالب کی مشہور نثری تالیف "پنج آہنگ" کے بہت سے نسخے ہیں۔ یہاں صرف انھیں نسخوں کی فہرست دی جاتی ہے جو لگ بھگ ایک صدی پہلے ۱۸۳۹ء سے ۱۸۸۸ء تک یعنی تقریباً ۵۰ سال کے عرصے میں لکھے گئے یا شائع ہوئے۔

۱۔ پنج آہنگ (قلمی)۔ آخری چند صفحے غائب ہیں اس لیے ترقیمہ موجود نہیں۔ کتابت شدہ تقریباً مئی ۱۹۳۹ء تا مئی ۱۸۴۰ء

۲۔ ایضاً (قلمی)۔ کتابت شدہ ۲۳ مئی ۱۸۴۰ء

۳۔ ایضاً۔ مطبوعہ ۴ر اگست ۱۸۴۹ء

۴۔ ایضاً۔ مطبوعہ اپریل ۱۸۵۳ء

۵۔ کلیاتِ نثر غالب (اس میں "پنج آہنگ" شامل ہے) مطبوعہ نولکشور لکھنؤ (طبع اوّل، جنوری ۱۸۶۸ء)

۶۔ ایضاً.......... مطبوعہ نولکشور (طبع دوم، جنوری ۱۸۷۱ء)

۷۔ ایضاً.......... مطبوعہ نولکشور.......... ۱۸۷۵ء

۸۔ ایضاً.......... ایضاً.......... ۱۸۸۳ء

۹۔ ایضاً.......... ایضاً.......... ۱۸۸۸ء

مندرجہ بالا فہرست کے پہلے ۵ نسخے اہم ترین ہیں کیوں کہ یہ سب غالب کی زندگی میں کتابت ہوئے یا طبع ہوئے اور چھٹا نسخہ (مطبوعہ ۱۸۷۱ء) اگرچہ غالب کی وفات کے بعد شائع ہوا تو بھی اہم ہے کیوں کہ اس میں دو خط اضافہ کیے گئے تھے۔ بقیہ تینوں نسخے (۷،۸،۹) اسی کی نقل ہیں اس لیے چنداں اہمیت کے حامل نہیں۔

پنج آہنگ کی بنیاد کا ایک قصہ ہے۔ بھرت پور کے قضیے میں جب انگریزوں اور دُر جن سال کی ٹھن گئی تو اس جنگ میں حصہ لینے کے لیے نومبر، دسمبر ۱۸۲۵ء میں نواب احمد بخش خاں انگریزوں کی طرف سے گئے تھے ان کے ہمراہ غالب اور مرزا علی بخش خاں (غالب کے برادر نسبتی) بھی تھے۔ یہ قضیہ ۱۸ جنوری ۱۸۲۶ء کو ختم ہوا اور دُر جن سال کو ریاست سے نکال دیا گیا (ذکرِ غالب۔ پانچواں ایڈیشن ص ۵۷۔ ۵۸) وہیں ۱۸ جنوری ۱۸۲۶ء سے کچھ پہلے یا بعد، اپنی رہنمائی کے لیے مرزا علی بخش خاں نے غالب سے ایسے تمام کلمات جمع کر دینے کے لیے کہا جو خطوں میں القاب، آداب اور شکر و شکوہ و شادی و غم کے اظہار کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس پر مرزا نے تین روز میں آہنگِ اوّل (قلمی۔ آہنگِ سوم) ترتیب دیا اور کچھ عرصے بعد آہنگ دوم (قلمی۔ آہنگِ پنجم) "مصادر و مصطلحات و لغات فارسی" لکھا۔ یہ آہنگ اگرچہ ۱۸۲۶ء ہی میں لکھا گیا تھا مگر اس وقت غالب بھرت پور میں نہیں تھے۔ جیسا کہ مقدمہ پنشن کے عرضی دعوے (فسانۂ غالب ص ۱۱۱) سے ثابت ہوتا ہے۔ نواب احمد بخش خاں جنوری ۱۸۲۶ء کے بعد چندے بیمار رہ کر بھرت پور سے فیروز پور آ گئے تھے اور غالب انھیں کے ساتھ رہے۔ فیروز پور کا علاقہ ریگستانی ہے۔ جس کا ذکر غالب آہنگِ دوم کی تمہید میں کرتے ہیں اور وہیں ان کا یہ کہنا کہ مرزا علی بخش خاں ہی کی خواہش پر، آہنگِ دوم (آمیزۂ پارسی زبان و ہنجار ایں گفتار سخن) لکھنے پر میں تیار ہوا تھا، اس بات کا مزید ثبوت ہے کہ ابھی وہی سفر جاری ہے جو نواب احمد بخش خاں اور مرزا علی بخش خاں کے ساتھ، غالب نے دلّی سے نومبر۔ دسمبر ۱۸۲۵ء میں شروع کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سفر کئی ماہ تک جاری رہا۔ اس طرح پنج آہنگ کی نیو دسمبر ۱۸۲۵ء میں پڑی اور آہنگِ دوم اوایل ۱۸۲۶ء میں لکھا گیا۔ اگرچہ اس وقت پانچ آہنگوں کا کوئی خاکہ ذہن میں نہیں تھا۔ نہ مرزا غالب کے نہ مرزا علی بخش خاں کے۔ آہنگِ سوم آخر ۱۸۲۹ء یا اس کے کچھ بعد مرتب ہوا اور بقیہ دو آہنگ ۱۸۳۵۔۳۶ء میں ترتیب دیے گئے (اگرچہ اضافے مسلسل ہوتے رہے) اور وہیں اس مجموعہ نثر کا نام پنج آہنگ رکھا گیا جیسا کہ مرزا علی بخش خان کے دیباچے سے ظاہر ہے۔ دیباچہ پنج آہنگ مرزا علی بخش خاں (مرزا غالب کے برادر نسبتی اور الٰہی بخش خاں معروف کے صاحبزادے) نے لکھا تھا۔ مرزا علی بخش خاں (جو نواب شمس الدین احمد خاں کے چچازاد بھائی

تھے اور ان کے کاروبارِ ریاست سے مطمئن نہ تھے) کچھ دیر کے لیے لکھنؤ اور پھر جے پور چلے گئے تھے۔ شمس الدین احمد خاں کی وفات کے بعد یہ واپس دلی آگئے اور قیاس ہے کہ اکتوبر کے آخر تک دہلی پہنچ گئے ہوں گے۔ وہ دلی میں اپنے بہنوئی غالب کے یہاں ٹھہرے۔ مرزا علی بخش خاں نے دیباچے میں لکھا ہے کہ شمس الدین احمد خاں کا واقعہ (قتل فریزر اور پھانسی) ۱۲۵۱ھ کے آغاز میں ہوا تھا۔ ۱۲۵۱ھ، ۳۰/اپریل ۱۸۳۵ء تا ۱۷/اپریل ۱۸۳۶ء کے مطابق ہے۔ ولیم فریزر کا قتل ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء (۲۱ شوال ۱۲۵۰ھ) کو ہوا تھا اور شمس الدین احمد خاں کو پھانسی ۸/اکتوبر ۱۸۳۵ء (۱۴ جمادی الثانی ۱۲۵۱ھ) کو دی گئی تھی۔ غالب اپنے ایک خط بنام شیفتہ (جو پنج آہنگ میں شامل ہے) میں لکھتے ہیں کہ مرزا علی بخش خاں جے پور سے بیمار ہو کر آئے ہیں اور میرے پاس ہی رہ رہے ہیں یہ خط کا اصل جملہ ملاحظہ فرمایئے کیوں کہ اس نے ایک عجیب غلط فہمی پیدا کردی ہے۔ جس کی لپیٹ میں غلام رسول مہر اور وزیر الحسن عابدی جیسے ماہرینِ غالبیات بھی آگئے ہیں۔ غالب کہتے ہیں:

"برادر بجاں برابر مرزا علی بخش خاں بہادر رنجور از جے پور آمدہ و بہ کاشانۂ نامہ نگار طرحِ اقامت کردہ......"

یہاں غالب نے رنجور بمعنی علیل استعمال کیا تھا (آگے چل کر وہ بیمارداری کا ذکر بھی کرتے ہیں) مگر یار لوگوں نے اسے علی بخش خان کے ساتھ بطور تخلص جوڑ دیا۔ اس کی ایک وجہ اور بھی سمجھ میں آتی ہے۔ غالب کے علاوہ، علی بخش خاں کے ایک دوسرے بہنوئی (بڑی بہن بنیادی بیگم کے شوہر) بھی تھے۔ ان کا نام نواب غلام حسین خاں اور تخلص مسرور تھا۔ چوں کہ رنجور، مسرور کا ہم قافیہ ہے اس لیے عموماً یقین کر لیا گیا ہو گا کہ بہنوئی کا تخلص مسرور ہے اور سالے کا رنجور، حالانکہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے کیوں کہ مرزا علی بخش خاں کا سرے سے شعر کہنا ہی ثابت نہیں۔

خیر، انھیں ایام میں غالب کے فارسی کلام کا مجموعہ میخانۂ آرزو سرانجام[1] کے نام سے

مرتب ہوا تھا۔ اس میں مرزا علی بخش خاں نے غالب کی نثر پڑھی تو خیال آیا کہ کیوں نہ ان کے دیوان کی تمام نثری تحریروں کو یکجا کر دیا جائے، لیکن علی بخش خان کے ایک ہم سبق میر محمد حسین خاں بھی ان کے ساتھ ہو گئے۔ یہ بھی خیال کیا کہ ان کا لڑکا غلام فخر الدین خاں

اس سے استفادہ کرے گا۔ چنانچہ اس ارادے نے صورت اختیار کرلی اور یہ کلام جو پنج آہنگ پر مشتمل ہے آراستہ ہوا۔ ظاہر ہے دیوان کی نثری تحریروں کے ساتھ ۱۸۲۶ء کے اوراق اور دیگر متفرق نثری نگارشات کو بھی یکجا کر دیا گیا۔ یہ سب کلام فارسی نثر تک محدود تھا۔

یہاں کچھ غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے آہنگ سوم (قلمی۔ آہنگ چہارم) کا کچھ تفصیل سے ذکر کر دینا ضروری ہے۔ اس آہنگ کا عنوان ہے۔ "اشعارِ مکتوبی منتخب از دیوان رشکِ گلستاں کہ در مکاتبات بکار آید"۔ یہ عنوان مرزا علی بخش خاں نے اپنے دیباچے میں قائم کیا تھا جو آج تک جوں کا توں قائم ہے۔ متن میں آہنگ کا عنوان یہ ہے "آہنگِ سوم مشتمل بر اشعارِ مکتوبی منتخب از دیوان کہ در مکاتبات بکار آید و اقسام نثر را آرایش دہد"۔ قلمی نسخوں اور مطبوعہ نسخوں میں یہ فرق ہے کہ مطبوعہ نسخوں کے آہنگِ سوم کی جگہ آہنگِ چہارم ہے اور مکتوبی (قلمی) کی جگہ مکتوب ہے۔ دیباچے اور متن کے عنوانات میں ہر نسخے میں یہ فرق رکھ دیا گیا ہے کہ رشکِ گلستاں کے الفاظ نکال دیے گئے ہیں اور "و اقسام نثر را آرایش دہد" کا ٹکڑا بڑھا دیا گیا ہے باقی پورا کا پورا آہنگ وہی ہے جو پہلے پہل تالیف کیا گیا تھا۔

آہنگِ سوم کے کل اشعار کی تعداد ۱۳۴ ہے، جس میں ۳ رباعیاں (۶ شعر) بھی شامل ہیں۔ یہ سب شعر اسی دیوان سے لیے گئے ہوں گے جو ۱۸۳۵ء میں "میخانۂ آرزو سر انجام" کے نام سے مرتب ہوا تھا۔ بہر حال ۱۸۳۵ء میں جو دیوان اشاعت پذیر ہوا ہے، یہ اشعار اس میں شامل ہیں۔ میں نے بیشتر اشعار مقابلہ کر کے دیکھے ہیں اور یہ اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ یہ آہنگ ۱۸۳۵ء ہی میں لکھا گیا تھا اس سے پہلے نہیں۔ اشعار میں بعض مقامات پر لفظی ترمیمیں ہیں، جو دلچسپی سے خالی نہیں۔

پنج آہنگ قلمی (۱۸۳۵ء)	کلیات۔ طبع اول (۱۸۳۵ء)	پنج آہنگ طبع اول (۱۸۳۹ء)
پریشاں تر ز خویشم داستانیست	پریشاں تر ز ظلم......	پریشاں تر ز خویشم......
غبارش جوہر جانست گوئی	غبارش جوہر......	غبارش گوہر......
کجاست دست کہ چیدم ثمر ز نخلِ مراد	نخلِ اُمید......	نخلِ مراد......
کیں رم و فا ندارد اثر......	کوئی وفا......	کیں رم وفا......

فرقیست نہ اندک...... فرقیست...... فرق است......

ہر پارۂ دل کہ ریزم از دیدۂ فرد ......از دیدۂ من ......از دیدۂ فرد

تمام (۱۳۴) اشعار نعتوں، مثنوی چراغ دیر، مثنوی رنگ و بو، مثنوی باد مخالف، غزلوں اور رباعیوں (۳) سے لیے گئے ہیں اور غالب کے کلام فارسی طبع اوّل (۱۸۴۵ء) میں چھپ چکے ہیں۔

آہنگوں کی ترتیب جو قلمی نسخوں میں ملتی ہے یہ ہے:

۱۔ آہنگِ اوّل۔ نثرہائے داخلِ دیوان کرامت نشان

۲۔ آہنگِ دوم۔ نثرہائے خارج دیوان

۳۔ آہنگِ سوم۔ القاب و آداب و مراتب متعلقہ آں

۴۔ آہنگِ چہارم۔ اشعار مکتوبی منتخب از دیوان رشکِ گلستاں کہ در مکاتبات بکار آید۔

۵۔ آہنگِ پنجم۔ مصادر و مصطلحات و لغاتِ فارسی۔

مگر جب پنج آہنگ پہلی بار ۱۸۴۹ء میں شائع ہوئی تو آہنگوں کی ترتیب میں نمایاں فرق کر دیا گیا۔ جس کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ آہنگِ اوّل۔ القاب و آداب و مراتب متعلقہ آں (آہنگِ سوم۔ قلمی)

۲۔ آہنگِ دوم۔ مصادر و مصطلحات و لغاتِ فارسی (آہنگ پنجم۔ قلمی)

۳۔ آہنگِ سوم۔ اشعار مکتوبی منتخب از دیوان رشکِ گلستاں کہ در مکاتبات بکار آید۔ (آہنگِ چہارم۔ قلمی)

۴۔ آہنگِ چہارم۔ خطب و کتب و تقاریظ و عبارات متفرقہ

۵۔ آہنگِ پنجم۔ مکاتبات۔

متنِ مطبوعہ میں مرزا علی بخش خاں

پنج آہنگ کے اصل مؤلف غالب کے برادر نسبتی مرزا علی بخش خاں تھے۔ جب تک پنج آہنگ مسودے کی شکل میں رہی وہی اس کے مؤلف ٹھہرے رہے مگر جب مسودے کو طباعت کے لیے تیار کیا گیا تو اس میں اُوپر دی ہوئی آہنگوں کی ترتیب میں ردوبدل کے علاوہ

ایک بنیادی تبدیلی اور عمل میں آئی۔ اب مرزا علی بخش خاں کی جگہ کم و بیش غالب خود مؤلف کے مقام پر جلوہ گر ہو گئے تاہم دیباچہ مرزا علی بخش خاں ہی کا رہا اور ذیل کی ایسی معمولی حک و ترمیم کے علاوہ آج تک یوں کا توں موجود ہے۔ ترمیم یہ ہے:

۱۔ قلمی ...... چوں فخر الدولہ بہادر کہ خدائش بفردوس بریں جا داد ......

مطبوعہ ...... چوں فخر الدولہ کہ خدائش در بہشت بریں جا داد ......

۲۔ قلمی ...... والا دودماں رضی الدین حسن خاں ......

مطبوعہ ...... والا دودمان حکیم رضی الدین حسن خاں بہادر ......

پنج آہنگِ قلمی کے آہنگ اوّل کے آخر میں، جہاں یہ سات نثری تحریریں (۱) دیباچہ دیوانِ فارسی (۲) دیباچہ گلِ رعنا، (۳) دیباچہ دیوان ریختہ (۴) نامہ بنامِ نامی نواب سید علی کبر خاں متوالی امام باڑہ ہوگلی بندر (۵) خاتمہ گلِ رعنا (۶) خاتمہ عبارت و باعثِ ترتیبِ دیوانِ فارسی (۷) خاتمہ دیوانِ فارسی ختم ہوتی ہیں۔ ایک تحریر مرزا علی بخش خاں جامع پنج آہنگ کی طرف سے ہے جس کا ضروری اقتباس یہ ہے:

"لللہ الحمد کہ جامع ایں اوراق یعنی علی بخش ...... ہمگی نثر از دیوان ......
حضرت غالب، درایں اجزا نقل کردہ آہنگِ اوّل را سر انجام داد و آمادۂ گزارشِ دومیں آہنگ شد ...... نثرہائے خارج از دیوان بسیار است ......
باحباب اجازت ایں معنی داد و می آید کہ از ہر چہ از عباراتِ غالبی در زمانہائے مختلف بنظر گزرد، آں را دریں آہنگ جا دہند و بر جامع (علی بخش خاں) ایں پنج آہنگ منت نہند۔ ..."

مطبوعہ کتاب میں یہ پوری عبارت حذف کر دی گئی ہے۔ پنج آہنگ میں علی بخش کے نام کے چار خط ان عنوانات کے ساتھ شامل تھے۔ (۱) نامہ کہ از دہلی بنام ایں مستہام رقم فرمودہ، (۲) رقعہ بنام جامع کتاب (۳) خط بنام کمترین کہ از کلکتہ فرستادہ اند (۴) ایضاً ...... [۲]

مستہام، جامع کتاب، کمترین سے صاف ظاہر ہے کہ یہ خطوط مؤلفِ کتاب علی بخش خاں کے نام ہیں۔ مگر طبعِ اوّل (۱۸۴۹ء) میں یہ سب عنوانات اس طرح بدل دیے گئے (۱) نامہ کہ از دہلی بنام مرزا علی بخش خاں بہادر رقم شد (۲) ایضاً (۳) ایضاً از کلکتہ (۴) ایضاً از کلکتہ۔

اس طرح مرزا علی بخش خاں کی حیثیت بطور جامع یا مؤلف کتاب ختم ہو گئی۔

قلمی اور مطبوعہ متن کا فرق

قلمی اور مطبوعہ نسخوں کے متن میں فرق ناگزیر تھا کیوں کہ جیسا کہ مرزا علی بخش خاں کی حذف شدہ تحریر سے ثابت ہے ابھی غالب کی متفرق تحریریں جمع ہو رہی تھیں، خاص کر خطوط۔ مگر ان کے علاوہ بھی متن میں بہت سی ترامیم کی گئی ہیں مثلاً قلمی نسخے کا آہنگِ پنجم (مطبوعہ نسخے کا آہنگِ دوم) "پانچ رمز موں" پر مشتمل ہے۔ مگر مطبوعہ نسخوں میں صرف "چار رمزے" ہیں۔ پورے متن کا مقابلہ بہت دقت نظری کا کام ہے اور الگ سے ایک مقالے کو محیط ہو سکتا ہے اس لیے یہاں نظر انداز کیا جاتا ہے۔ مکتوبات کے لیے احتیاط خاص طور پر ضروری ہے کیوں کہ غیر مطبوعہ اور مطبوعہ متون کا فرق غالب کے اس عہد کے سوانح پر بہت کچھ اثر انداز ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے ایسے خطوں کو پورا کا پورا رد کر دینا پڑے جن میں ترمیم سے نفسِ مضمون تک بدل گیا ہو گا کیوں کہ خطوں کا مضمون بعد میں نہیں بدلا جا سکتا۔

اب اوپر دیے ہوئے اہم نسخوں کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) پنج آہنگ۔ قلمی نسخہ نمبر ۱

یہ قدیم نسخہ ناقص الوسط اور ناقص الآخر ہے، تاہم کتاب کا نوے فی صد حصہ باقی ہے اور جو صفحات نہیں ہیں ان سے کچھ ایسا نقصان نہیں ہوا سوائے ترقیمے کے ضائع ہونے کے، جس کی وجہ سے مخطوطے کی تاریخ کتابت متعین کرنے میں دشواری آ رہی ہے۔ صفحات ۱۹۱ ہیں (نمبر میں نے لگائے ہیں) یہ ۱۵ سطری (کہیں کہیں ۱۶ سطریں بھی ہیں) مخطوطہ کسی دوسرے مخطوطے کی نقل ہے جسے غالب سمیت ۱۸ نقل نویسوں نے پورا کیا ہے۔ مرزا علی بخش خاں کا دیباچہ ص ۴ پر ختم ہوتا ہے اور وہیں سے آہنگِ اوّل "نثرہائے داخل دیوان کرامت نشان" شروع ہوتا ہے۔ ص ۴۲ پر علی بخش خاں کی وہ عبارت (للہ الحمد کہ جامع......

منت نہند" ہے۔ جو مطبوعہ نسخوں میں شامل نہیں کی گئی۔ ص ۴۳ سے آہنگِ دوم "نثرہاے خارج دیوان" شروع ہوتا ہے ص ۹۱ پر شیخ امیر اللہ سرور کے خط کے خاتمے پر نقل نویس سے ایک اردو شعر چھوٹ گیا تھا جسے حاشیے میں ایسے خط میں اضافہ کیا گیا ہے جو غالب کے خط سے ملتا جلتا ہے مگر وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ خطِ غالب ہے:

نہ خریدار کا حصہ ہوں نہ حق بائع کا
میں وہ دانہ ہوں کہ گر جائے کفِ میزاں سے

والسلام

-ص ۹۴ پر نواب مصطفےٰ خاں (شیفتہ) کے خط میں غالب لکھتے ہیں "امروز کہ ...... اندوہ درونی، بہ پارسی نا آمیختہ بہ تازی نگاشتہ آمد......" آج جب کہ اندوہ درونی کو خالص فارسی (جس میں کوئی لفظ عربی کا نہیں) میں لکھا ہے۔ [اُردی بہشت کا بہمن روز ہے اور عیسوی ۲۲ اپریل ہے] یہ خط ۳۶۔ ۱۸۳۵ء کے آس پاس لکھا گیا ہے اگر یزدگردی سنہ کے مطابق ۱۸۳۵ء کے اِدھر اُدھر کسی سال میں ۲/ اُردی بہشت اور ۲۲/ اپریل ایک ہی دن پڑتے ہوں تو خط کی صحیح تاریخ معلوم ہو جائے گی۔ یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ غالب کو خالص فارسی میں لکھنے کا ہوکا شاید جوانی ہی سے تھا[۳] جس کا مظاہرہ پوری قوت سے دستنبو (۵۸۔ ۱۸۵۷ء) میں ہوا مگر باوجود زبردست احتیاط کے بعض عربی کے الفاظ اس میں آ گئے۔ یہی حال بیس بائیس سال پہلے سے اس خالص فارسی خط کا ہے۔ اس میں بھی بعض الفاظ ایسے آ گئے جو خالص فارسی نہیں ہیں مثلاً "ایں ہواے شگفت" میں ہوا اور "ماتم زدگان" میں ماتم۔ "ماتم زدہ" اگرچہ فارسی میں رائج ہے مگر ماتم کی اصل عربی ہے۔

ص ۹۸ "آرایشِ گفتار اور ظہور ہور و نموداری صبح" کے آخری چند شعر (پانچ سطریں) غالب کے قلم سے ہیں۔ ان سطور سے پہلے اور بعد کا قلم ایک ہی ہے صرف درمیان کی پانچ سطریں غالب کے خط میں ہیں۔ ص ۱۵۵ پر آہنگ دوم ختم ہو جاتا ہے اس میں صرف ۶۹ خط ہیں۔ "والسلام" لکھنے کے بعد آہنگ ختم ہو جاتا ہے اور پھر صفحے کا ایک تہائی حصہ خالی چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس کے آگے کتابت شدہ اوراق ضائع ہونے کا کوئی احتمال نہیں۔ ص ۱۵۶ سے آہنگِ سوم (مطبوعہ آہنگِ اوّل) شروع ہوتا ہے۔ ص ۱۵۷ سے تقریباً ۱۲

اوراق غائب ہیں۔ ص ۱۷۵ سے آہنگ چہارم (مطبوعہ آہنگ سوم) ہے جس میں ۱۳۴ شعر ہیں اور سب کے سب غالب کے فارسی کلامِ طبع اوّل میں موجود ہیں۔ ظاہر ہے یہ اوّلین تدوین دیوان یا کلیات "میخانۂ آرزو سرانجام" (۱۸۳۵ء) ہی سے اخذ کیے گئے ہیں۔ ص ۱۸۲ پر یہ آہنگ ختم ہوتا ہے اور وہیں سے آہنگِ پنجم (مطبوعہ آہنگِ دوم) کا آغاز ہوتا ہے۔ شروع کی عبارت یہ ہے "ازیں آہنگِ پنج زمزمہ می خیزد، نخستین زمزمہ بدیباچگی ایں آہنگ روشناس......" مطبوعہ نسخوں میں پنج زمزمہ کو "چار زمزمہ" سے اور نخستین زمزمہ بدیباچگی ایں آہنگ روشناس" کو "نخستین زمزمہ بنگاتے کہ حقیقت مصادر ازاں بے پردہ گردد" سے بدل دیا گیا ہے۔ گویا ایک "زمزمہ" کم کر دیا گیا ہے۔ آخر کے ۱۲ صفحے غائب ہیں جن میں ترقیمہ بھی ضائع ہو گیا ہے۔ اس طرح مخطوطہ ۱۹۱ صفحہ پر ختم ہو جاتا ہے۔

یہ قلمی نسخہ جسے میں نے نسخہ نمبر ۱ کا نام دیا ہے کسی ایک پیشہ ور کاتب کا لکھا ہوا نہیں ہے بلکہ مختلف اوقات میں کم از کم ۱۸ نقل نویسوں نے کہیں خوشخط کہیں خط شکست میں لکھا ہے غالباً یہ منتشر اوراق سے صاف کیا ہوا مسودہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے قلمی نسخہ نمبر ۲ (جس کا حال آگے آئے گا) اسی کو سامنے رکھ کر ایک پیشہ ور کاتب نے ۲۳ مئی ۱۸۴۰ء کو مکمل کیا تھا۔ گویا نسخہ نمبر ۱، ۲۳ مئی ۱۸۴۰ء سے پہلے کا ہے۔ نسخہ نمبر ۱ میں وہ خط بنام میر سید علی خان عرف حضرت جی (یہاں خط کا عنوان خالی چھوڑ دیا گیا ہے) موجود ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ پنشن کے مقدمے کی اپیل کے کاغذات کو اب لنڈن گئے دو سال ہوتے ہیں۔ لنڈن کو یہ کاغذ ۱۰ مئی ۱۸۳۷ء کو گئے تھے۔ اس طرح نسخہ نمبر ۱، ۱۰ مئی ۱۸۳۹ء یا اس کے بعد کا لکھا ہوا قرار دیا جا سکتا ہے۔ گویا نسخہ نمبر ۱، ۱۰ مئی ۱۸۳۹ء - ۲۳ مئی ۱۸۴۰ء تک کے عرصے میں کسی وقت بھی پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

قلمی نسخہ نمبر ۲ کو میں قلمی نسخہ نمبر ۱ کی صاف شدہ صورت ان وجوہات کی وجہ سے قرار دیتا ہوں۔

۱۔ نسخہ نمبر ۱ بہت سے ہاتھوں کا لکھا ہوا ہے جب کہ نسخہ نمبر ۲ ایک ہی خط میں اور ایک پلان کے تحت کتابت ہوا ہے۔ مواد اگرچہ وہی ہے مگر معمولی اضافے بھی ہوئے ہیں۔

۲۔ نسخہ نمبر ۱ میں بہت سی غلطیاں راہ پا گئی ہیں۔ اس میں کا ہر نقل نویس کافی محتاط نہ تھا۔ یہ تمام غلطیاں نسخہ نمبر ۲ میں درست کر دی گئی ہیں۔

۳۔ ص ۵۴ پر مرزا علی بخش خاں کے نام کے ایک خط کا عنوان اس سے پہلے کے خط کی وجہ سے (جس کا عنوان خط بنام کمترین کہ از کلکتہ فرستادہ اند، تھا) ایضاً، لکھا تھا، اسے نسخہ نمبر ۲ میں یہ عنوان دیا گیا ہے۔ "خط کہ ہم از کلکتہ بعقیدت کیش نگاشتہ اند"۔ ظاہر ہے کہ یہ نسخہ نمبر ۱ پر اضافہ ہے۔

۴۔ ص ۸۹ پر نسخہ نمبر ۱ میں ایک خط کا عنوان ہے "در رسید مکتوب"۔ نسخہ نمبر ۲ میں اسے "نامہ بدوستے در رسید مکتوب" میں بدل دیا گیا ہے۔ یہ بھی نسخہ نمبر ۱ پر اضافہ ہے ایسے اور بھی کئی اضافے ہیں۔

۵۔ نسخہ نمبر ۱ میں بہت سے عنوانات کی جگہ خالی چھوڑ دی گئی تھی۔ نسخہ نمبر ۲ میں یہ سب عنوانات پُر کر دیے گئے ہیں۔

(۲) پنج آہنگ۔ قلمی نسخہ نمبر ۲

پہلے ترقیمہ ملاحظہ کیجیے:

"نسخہ پنج آہنگ تصنیف جناب اسد اللہ خاں و معروف مرزا نوشہ بموجب حکم احترام الدولہ رئیس الحکما حاذق الزماں حکیم سید احسن اللہ خاں صاحب بہادر ثابت جنگ، بخطِ خام بندہ سید غلام عباس ولد سید حسن علی ساکن کول محلہ بے گنج وبالفعل وارد بشاہجہان (آباد)[۴]

بتاریخ بست (۲۳) سیوم ماہ مئی ۱۸۴۰ء عیسوی مطابق بستم (۲۰) ربیع الاول ۱۲۵۶ھ بروز شنبہ بوقت چہار گھڑی روز باقی ماندہ بود صورتِ اختتام پذیرفت۔ تم تم تم تم تم تم"

جناب وزیر الحسن عابدی مرحوم نے "پنج آہنگ" (مجلس یادگار غالب۔ لاہور ۱۹۶۹ء) مرتب کرنے میں جن ماخذوں سے کام لیا ہے ان میں ایک ماخذ وہ قلمی نسخہ ہے جس کا ترقیمہ

ہو بہو وہی ہے جو میں نے اُوپر دیا ہے۔ نسخہ نمبر ۲ میری ملک میں گزشتہ آٹھ دس سال سے ہے۔ اس لیے یہ قطعی ممکن ہے کہ یہ نسخہ نمبر ۲ اس سے پہلے کبھی وزیر الحسن عابدی صاحب کے پیش نظر رہا ہو مگر ان میں سے لیے ہوئے حوالے اتنے گمراہ کن ہیں کہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ عابدی صاحب نے حقیقتاً یہ مخطوطہ کبھی دیکھا نہ ہوگا، محض خطوں کی تفصیل اور ترقیمے کی نقل منگوائی ہوگی۔ یہ شک اس لیے بھی قوی ہو جاتا ہے کہ جہاں اُنھوں نے اپنی کتاب میں دوسرے دو خطی نسخوں کی تفصیل دی ہے وہاں اس نسخہ نمبر ۲ کی سرے سے تفصیل ہی نہیں دی، محض ترقیمہ نقل کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نسخہ نمبر ۲ کے مکاتبات والے آہنگ کا کچھ حصہ ضائع ہو چکا ہے اس لیے چند خط اب اس مخطوطے کا حصہ نہیں رہے۔ عابدی صاحب اس خیال میں رہے کہ شاید یہ خط اس نسخے میں کبھی شامل ہی نہ تھے لہٰذا انھوں نے ان خطوں کو ۱۸۴۰ء کے بعد کا مان لیا جو غلط ہے کیوں کہ یہ تمام خط نسخہ نمبر ۱ (۱۸۳۹ء) میں شامل ہیں۔ عابدی صاحب لکھتے ہیں "آرایش گفتار در ظہور ہور و نمود اری صبح" ۱۸۴۰ء کے نسخے میں یہ عنوان نہیں ہے اس کے بجائے یہ لفظ ہیں "بعرفان نواب غلام حسین" (دیباچہ آہنگ عابدی ص ۱۰)۔ مگر یہ سراسر غلط ہے "آرایش گفتار" والا عنوان ۱۸۴۰ء (نسخہ نمبر ۲) کے ص ۱۰۲ پر موجود ہے۔ یہی بات اُنھوں نے عنوان "سخن در ہجوم ظلمتِ شب" کے متعلق لکھی ہے وہ بھی قطعی غلط ہے۔

نسخہ نمبر ۲ کے شروع (دیباچہ مرزا علی بخش خاں) کا آدھا صفحہ نہیں۔ تمام نسخہ ۱۶ سطری ہے اور خوب صورت نیلی اور سرخ دھاریوں سے گھرے ہوئے حوض میں لکھا ہوا ہے۔ درمیان سے کچھ اوراق غائب ہیں، اس کے باوجود مخطوطہ ۲۰۶ صفحوں کو محیط ہے (نمبر میں نے دیے ہیں) ترتیب قطعی نسخہ نمبر ۱ کے مطابق ہے۔ وہ تمام غلطیاں جو نسخہ نمبر ۱ میں در آئی تھیں رفع کر دی گئی ہیں اور عنوانات کی خالی جگہ سرخ روشنائی سے پُر کر دی گئی ہے۔ اشعار جو نسخہ نمبر ۱ میں نثری انداز سے لکھے ہوئے تھے۔ اب نظم کے پیرائے میں ہیں۔ ص ۱۲۶ کے بعد چند اوراق (مکاتبات) غائب ہیں۔ ہر صفحے پر حوض کا بیرونی سائز تقریباً ۲۶×۱۴ سینٹی میٹر ہے۔ نسخہ نمبر ۱ کا سائز بھی تقریباً یہی ہے مگر اس کا حوض کا سائز معین نہیں۔

(۳) پنج آہنگ۔ طبعِ اوّل

دیگر معمولی متنی ردّوبدل کے علاوہ (جس کا ذکر اس مقالے میں نہیں کیا جائے گا) دو باتیں خاص طور پر توجہ طلب ہیں۔ ایک تو وہی آہنگوں کی ترتیبِ نو جو پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ دوسری متفرق نثروں اور خطوں کی تعداد، یعنی اب ۱۸۴۹ء میں نثروں کی تعداد بڑھ کر ۱۶ ہو گئی اور خطوں کی تعداد ۱۲۸، ۵ قلمی نسخہ نمبر ۱ میں صرف ۶۹ خط تھے۔ گویا ۵۹ خطوں کا اضافہ ہوا۔

یہ کتاب اوسط تقطیع کے ۳۹۳ صفحات پر مطبعِ سلطانی میں چھپی تھی۔ خاتمے کی عبارت یہ ہے:

"...... مجموعہ نثرہائے رنگا رنگ مسمّی بہ پنج آہنگ از نتائجِ طبع...... مرزا اسد اللہ خاں بہادر...... بہ تصحیح و ترتیب...... حکیم غلام نجف خاں بہادر کہ ارادتمندی باخانِ رفیع الشان ممدوح ے وارند، بتاریخ سیزدہم رمضان المبارک ۱۲۶۵ ہجری النبوی۔ ...... مطابق چہارم اگست ۱۸۴۹ء عیسوی در مطبع شاہی، بقلم شکستہ رقم احقر العباد شیخ احمد صورت اتمام یافت۔ فقط فقط، تم"

نسخہ مملوکۂ راقم میں جگہ جگہ دو قسم کی مہریں ثبت ہیں مگر دونوں ہی ٹھیک طرح پڑھی نہیں جاتیں۔ ایک تو کسی ذاتی لائبریری کے مالک کی ہے اور دوسری کسی ریاستی کتب خانے کے شاہی نشان والی ہے۔ بہت سی کے ساتھ بعض چھپے ہوئے اغلاط کی سیاہ روشنائی سے اصلاح بھی کی گئی ہے اور یہ عمل قدیم زمانے ہی کا کیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

(۴) پنج آہنگ۔ طبعِ دوم

یہ ایڈیشن ۴۴۴ صفحوں پر محیط ہے۔ آخر میں متن کے ختم ہوتے ہی "خاتمہ بالخیر" لکھ دیا گیا ہے۔ ضروری تفصیل سرورق پر آ گئی ہے جو یہ ہے:

"...... کتاب در علم قواعد فارسی و اشتقاق و تصحیح الفاظ اور انشائے رشیقہ ہر قسم مصنفہ...... شہنشاہِ ممالکِ علومِ عربی و فارسی ...... میرزا

محمد اسداللہ خاں بہادر...... در مطبع دارالسلام دہلی خاص مبینہ......
عنایت حسین، بہ تصحیح حضرت مصنف...... باہتمام نورالدین احمد
لکھنوی در ماہ اپریل ۱۸۵۳ء حلیہ اختتام ببر کشیدہ فقط۔"

اس ایڈیشن کے بعد غالب ۱۶ سال زندہ رہے اور شہنشاہ ملک علم عربی کہلاتے رہے۔ یہ مبالغہ آرائی کی حد ہے سب جانتے ہیں کہ وہ عربی بہت کم جانتے تھے۔ اس نسخے کے آخری صفحے پر غالب کا یہ شعر حاشیے میں لکھا ہے جو اگرچہ قدیم ہے مگر بخط غالب نہیں ہے:

دل دادہ ایم و داغ فراواں خریدہ ایم
یک غنچہ دادہ ایم و گلستاں خریدہ ایم

ص ۳ پر ایک مہر ہے۔ صرف...... علی ۱۲۶۷ھ پڑھا جاتا ہے۔ یہ کتاب ۱۲۶۹ھ میں چھپی تھی۔ ظاہر ہے کسی نے وہ مہر اس پر ثبت کر دی جو ۱۲۶۷ھ میں بنائی گئی تھی۔ کسی ریاستی کتب خانے کی مہر بھی اندرونی صفحات پر لگی ہوئی ہے جو بلا تاریخ ہے۔

اس ایڈیشن میں خطوں کی تعداد بڑھا کر ۱۵۳ کر دی گئی ہے اور دو نثروں کا اضافہ ہوا ہے۔

(۵) کلیاتِ نثر غالب۔ طبعِ اوّل

یہ کلیات بڑے سائز کے ۲۱۲ صفحات پر محیط ہے۔ شروع میں ۲ صفحے فہرست کے زائد ہیں اس میں پنج آہنگ، ص ۲ سے ص ۱۲۲ تک ہے۔ آخر میں خاتمہ پنج آہنگ بھی ہے۔ جو پہلی بار چھپا ہے۔ کتاب کا خاتمۃ الطبع اس طرح ہے:

"الحمدللہ...... دریں زماں...... از ترشحات قلم...... فخر شعرائے
عرب و عجم...... اسداللہ خاں بہادر عرف میرزا نوشہ متخلص بہ
غالب...... چنانکہ در شانِ خود بفرماید......

نخستے ز دساتیر بود نامہ ما
ساسانِ ششم بکار دانی مائیم

...... کلیات نثر مشکبو اعنی پنج آہنگ و مہر نیمروز، و دستنبو...... در

مطبع...... منشی نولکشور...... بماہ جنوری ۱۸۶۹ء مطابق شہر رمضان المبارک ۱۲۸۵ھ لباسِ انطباع پوشیدہ مرغوب انام و مطبوع خواص و عوام گردید۔ فقط......"

اس کے بعد عیش کا کہا ہوا قطعہ تاریخ ہے اور کتاب ختم ہو جاتی ہے۔ "پنج آہنگ" میں کچھ اور نثروں اور خطوں کا اضافہ ہوا ہے غالب کی زندگی میں چھپنے والا یہ تیسرا اور آخری ایڈیشن ہے۔ اس کے تیرہ مہینے بعد غالب انتقال کر جاتے ہیں۔

(۶) کلیاتِ نثر غالب ۱۲۸۷ھ۔ طبعِ دوم

۱۵×۲۴ سائز کی یہ کتاب ۴۱۸ صفحات پر محیط ہے۔ یہ ذیل کے فرق کے علاوہ کلیاتِ نثر غالب طبعِ اوّل کی نقل ہے۔

۱۔ سائز چھوٹا ہے اس لیے صفحات بڑھ گئے۔ "پنج آہنگ" ص ۱۵۴ پر ختم ہوتی ہے۔

۲۔ جنوری ۱۸۷۱ء مطابق شوال ۱۲۸۷ھ میں مطبع نولکشور سے چھپی۔

۳۔ چوں کہ غالب کا انتقال ہو چکا تھا اس لیے ظاہر ہے کہ اس میں کے آخری دو خط منشی نولکشور نے اپنی مرضی سے بڑھا دیے۔

۴۔ آخری دو خطوں میں ایک خط "میر غلام بابا خاں" کے نام ہے اس کے آخر میں یہ جملے اردو میں لکھے گئے ہیں:

"از اجاؤں کیا دیوانہ ہوں۔ لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں آپ کی عنایت سے اور بزرگوں کی دعا سے خوش و خورم ہوں اور اپنی عزت و آبرو سے بسر کرتا ہوں۔ خدا ایک وقت تم کو یہاں لاوے تو سب حال کھل جاوے۔ زیادہ کہنا زیادہ ہے۔ فقط۔"

۵۔ اسی نسخے میں پہلی بار ایک قطعہ (از: احمد حسن خاں جوشؔ) اردو میں بھی درج ہوا ہے:

بخط خوب کاغذ صاف پر۔ جوشؔ	بڑی صحت سے یہ لکھی گئی ہے
سنینِ طبع سال عیسوی میں	کہو کُل نثر غالب اب چھپی ہے

۶۔ خاتمہ "پنج آہنگ" جو پہلی بار ۱۸۶۸ء میں چھپا تھا، میں دوسری باتوں کے علاوہ غالب نے یہ بھی کہا ہے کہ اب آیندہ سے مجھے جو کچھ کہنا ہوگا۔ وہ سرسری اور تکلف سے بری اردو میں لکھا کروں گا تاکہ زندگی آسان بسر ہو۔ یہ خاتمہ اس نسخے میں بھی شامل ہے۔

حواشی

(۱) مجھے شبہ تھا کہ "بے خانۂ آرزو سرانجام" تاریخی نام ہونا چاہیے مگر گنتی کرنے پر صحیح سال برآمد نہیں ہوتا تھا۔ آخر کار یہ عقدہ غالب کی اس رباعی سے حل ہوا جو ڈاکٹر حنیف نقوی نے دریافت کی۔ ملاحظہ کیجیے "پنج آہنگ" کا قدیم ترین نسخہ مطبوعہ ۱۹۹۳ء ص چودہ۔

رباعی یہ ہے:

غالب ایں کارنامہ را نام بگوے
"بے خانۂ آرزو سرانجام" بگوے
آحاد بگیر و از مآت و عشرات
تاریخ قبول نسبِ اِتمام بگوے

یعنی دہائیوں اور سیکڑوں کے زمرے میں آنے والے حروف سے تاریخ نکالو = م + خ ن + ر + س ر + ن م = ۵۰ + ۶۵۰ + ۲۰۰ + ۲۶۰ + ۹۰ = ۱۲۵۰ھ

(۲) مخطوطہ ۱۸۴۰ء میں اس کا عنوان یہ ہے "خط کہ نیز از: کلکتہ بعقیدت کیش نگاشتہ ند۔"

(۳) بقول عندلیب شادانی (صحیفہ غالب نمبر جنوری ۱۹۶۹ء۔ ص ۱۶۷) غالب نے عربی الفاظ کے بجائے فارسی الفاظ کا استعمال ابوالفضل (آئینِ اکبری) کے تتبع میں کیا اور یہ "پنج آہنگ کے ہر صفحے سے نمایاں ہے۔"

(۴) آباد لکھنے سے رہ گیا ہے۔

(۵) ۱۲۸ خط میں نے خود شمار کیے ہیں۔

مثنوی

بیانِ نموداریِ شانِ نبوت وولایت

ماہنامہ "آج کل" (اپریل ۱۹۹۰ء، ص ۹) میں جناب نورالحسن راشد کاندھلوی کالکھا ہوا ایک اہم مقالہ بہ عنوان "غالب کا منظومہ!...... "شائع ہوا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ کلیاتِ غالب فارسی (مطبوعہ ۱۸۶۳ء، ص ۱۰۲) میں شامل مثنوی ششم "بیان نموداری شانِ نبوت وولایت کہ در حقیقت پر تو نورالانوار حضرت الوہیت ست، اصلاً غالب کی طبع زاد نہیں۔ بقول نورالحسن صاحب۔

> "یہ مثنوی دراصل مولانا محمد سالم (خلف مولانا سلام اللہ بن مولانا شیخ الاسلام حقی) دہلوی کی ایک تحریر کی ترجمانی اور اس کا منظوم فارسی پیرہن ہے جو بہادر شاہ ظفر کی تعمیل ارشاد میں شعبان یا رمضان المبارک ۱۲۶۸ھ جون، جولائی ۱۸۵۲ء میں منظوم و مرتب ہوئی اور بہادر شاہ کی ہدایت کے مطابق مطبع سلطانی قلعہ معلی شاہ جہاں آباد (دہلی) سے اس کی اشاعت عمل میں آئی مگر تعجب ہے کہ خطوط غالب میں کلیاتِ نظم فارسی کی قدیم وجدید اشاعتوں میں اور احوال غالب پر دریافت معروف مآخذ میں مثنوی نموداری کی اس ترتیب واشاعت کا کہیں حوالہ واشارہ درج نہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس اشاعت کے نسخے انتہائی کمیاب بلکہ معدوم و مفقود ہیں۔

مجھے اس اشاعت کا ایک صاف ستھرا عمدہ نسخہ اپنے علمی محسن و کرما فرما جناب توفیق احمد صاحب علوی کیرانوی (خیل خورد کیرانہ ضلع مظفر نگر یوپی) کی عنایت سے حاصل ہوا ہے...... مولانا (محمد سالم) نے تحریک سید احمد شہید اور اس تحریک کے مخالف علما کے درمیان متنازعہ مذہبی اسلامی چند مباحث پر ایک تحریر مرتب کی، جس میں "وہابیوں کے بڑے بڑے اور مشہور عقیدوں کی تردید تھی۔"

مولانا محمد سالم نے یہ تحریر بہادر شاہ ظفر کے حضور پیش کی اور اس مضمون کو فارسی میں نظم کرا دینے کی درخواست کی۔ بہادر شاہ ظفر نے یہ درخواست منظور فرمائی اور غالب کو جو اس وقت دربار سے وابستہ اور مہر نیمروز کی ترتیب میں مشغول تھے، اس خدمت پر مامور کیا۔ تعمیل ارشاد ہوئی اور غالب نے اس مضمون کو نظم کر کے بہادر شاہ کے ملاحظہ سے گزارا، بہادر شاہ کو یہ ترتیب و ترجمانی بہت پسند آئی:

"بملاحظہ اعلیٰ حضرت کیواں منزلت گزرانیدہ
وبسیار پسند طبع مشکل پسند قدسی افتادہ"

بہادر شاہ نے اس کی فور اطباعت کا حکم دیا۔ اسی ارشاد کی بجا آوری میں یہ مثنوی مطبع سلطانی سے کتابی صورت میں جلوہ گر ہوئی۔

اس اشاعت میں دو صفحے کی تمہید ہے جو مثنوی کے سبب تالیف پر روشنی ڈالتی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

بعد حمد آفریں و نعت حضرت سید المرسلین و خاتم النبیین صلوٰۃ اللہ علیہ و علیٰ آلہ الطیبین، و اصحابہ الطاہرین، بر مرات ضمیر ارباب حقیقت و اصحاب طریقت منطبع میگرداند کہ دریں ولا سالک مسالک ہدایت ناہج مناہج شریعت، جامع معقول و منقول، حاوی فروع و اصول، مولانا ے معظم و مکرم مولوی محمد سالم زادہ مجدہ مسائل جو از استمداد از حضرات

انبیاء علیہم السلام خصوصاً جناب مستطاب خیر الانام واولیاے کرام قدس اللہ اسرارہم از روایات فتاوہاے فقیہہ نگاشتہ۔ بحضور خاقان گیتی ستان، وسلطان دارادربان حضرت ظل سبحانی خلیفۃ الرحمانی ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ وسلطانہ وافاض علی العالمین برہ واحسانہ پیش کش کردہ، بنابر نظم آں استدعا نمودہ بودند، چنانچہ حسب الحکم قضا شیم زبدۂ سخنوراں واسوۂ سخن فہماں نجم الدولہ مرزا اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ در یک صد و یک بیت خملگی مسئلہ ہاے جواز استمداد وغیرہ منظوم کردہ، بملاحظہ اعلیٰ حضرت کیواں منزلت گزرانیدند و بسیار پسند طبع مشکل پسند قدسی افتادہ، و بتاریخ نہم شہر شوال ۱۲۶۸ ہجریہ مقدسہ مطابق سال شانزدہم جلوس معلیٰ احکام دادند بنا بر طبع آں، در مطبع سلطانی شرف صدور یافتہ و لقالب طبع در آمدہ است۔ والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ!

مختصراً یہ کہ مولانا محمد سالم، حضرات انبیا خصوصاً حضرت خیر الانام اور بزرگان دین کے مسائل کا جواز، فقہی روایات سے لکھ کر، بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں لائے اور اس مضمون کو نظم کرانے کی درخواست کی۔ چنانچہ بہادر شاہ ظفر کے فرمان سے غالب نے اس تحریر کو نظم کر کے بادشاہ کے حضور پیش کیا۔ جو اُنھوں نے پسند فرمائی اور ۹ شوال ۱۲۶۸ھ مطابق ۲۸ جولائی ۱۸۵۲ء کو اس کی طباعت کا حکم دیا جو مطبع سلطانی سے (قیاساً اگست ۱۸۵۲ء میں) چھپی۔

تمہید میں صرف نظم کرنے کی بات ہے مگر بقول نور الحسن صاحب عنوان میں "ترجمہ تحریر" لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا محمد سالم کی اصل تحریر اردو نثر میں تھی۔ مقالہ نگار نے مولانا محمد سالم کی ذات سے بحث کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے وہ مختصراً یہ ہے:

"(الف) بحوالہ نزہۃ الخواطر مولانا محمد سالم نے اپنے عہد کے علماے تعلیم پائی تھی۔ حج و زیارت حرمین سے مشرف ہوئے تھے۔ ان کی چھ تالیفات کا ذکر ملتا ہے (اگرچہ اس رسالے کا ذکر نہیں)

(ب) بحوالہ خلیق احمد نظامی، مولانا محمد سالم اور مولانا نورالاسلام کے بعد شیخ محدث کے خاندان کی علمی حیثیت تقریباً ختم ہوگئی۔

(ج) بعض شہزادوں کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کے قلعۂ معلیٰ سے قریبی روابط تھے۔

(د) معلومات وماآخذ سے معلوم نہیں ہوتا کہ مولانا "جامع منقول و معقول" اور "حاوی فروع واصول" کہے جاسکتے ہوں۔ چنانچہ مثنوی میں جو ظاہر ہے مولانا محمد سالم کی "تحریر کا یہ تمام و کمال عکس و آئینہ ہے" "کوئی" دلیل ایسی نہیں جسے نثری یا شرعی کہا جاسکے...... البتہ انھیں پیش کرنے کا ڈھنگ نیا ہے [ظاہر ہے کہ یہ کمال غالب کا ہے"]

فاضل مقالہ نگار لکھتے ہیں:

مثنوی شانِ نبوت وولایت میں معروف ومتداول نسخوں کے مطابق کل ۱۲۸ اشعار ہیں جس میں ۲۸ شعر وہ ہیں جس میں امکان وامتناع نظیر کے موضوع پر بحث ہے، مگر زیرِ تعارف اولین اشاعت میں کل ۱۰۱ شعر ہیں۔ ان میں ۱۰۱ میں سے ۹۸ اشعار جوں کے توں وہی ہیں جو مثنوی کے متداول نسخوں میں شامل ہیں۔ قدیم اشاعت میں تین شعر اور متاخر ترتیب میں ۲۸ شعر ایسے ہیں جو ان طباعتوں میں ہر ایک کو دوسری سے ممتاز کرتے ہیں۔ دونوں نسخوں کا توافق اور اتحاد:

من سبک رو ہم گراں جاں نیستم
صد نشاں پیداست پنہاں نیستم

پر ختم ہوگیا ہے۔ اس کے بعد پہلی اشاعت اور موجودہ نسخوں کی ترتیب الگ الگ ہے اوّلین طباعت میں اس شعر کے بعد یہ تین شعر اور ہیں:

"غالب آہنگِ دعا را ساز دہ — ہمرہ آمیں بخت را آواز دہ
گفتہ ام زیں پیش بیتے دلنشیں — آورم از خویش بیتے دلنشیں

بر دعاے شہ، سخن کوتاہ باد
تا خدا باشد بہادر شاہ باد"

یہ تینوں شعر بعد کی اشاعتوں میں درج نہیں اور کم سے کم مطبوعہ نسخوں میں ایسا کوئی حوالہ اور وضاحت نہیں ملی جن میں ان اشعار کے وجود یا ان کے خارج کیے جانے کا کسی نے تذکرہ کیا ہو۔ یہ تینوں شعر مثنوی نمودار یِ شانِ نبوت کے دوسرے نسخوں میں شامل نہ ہونے میں تو یکساں ہیں۔ مگر ان تینوں میں سے تیسرا اور آخری شعر اس لحاظ سے منفرد ہے کہ وہ کلیاتِ نظم فارسی کی پہلی مثنوی سرمۂ بینش میں آخری شعر اور صرف اختتام کی حیثیت سے شامل ہے۔ اس لحاظ سے محولہ بالا دو شعر غالب کے نو دریافت کلام اور کلیاتِ نظم فارسی پر ایک اضافہ شمار کیے جاسکتے ہیں۔ جیسا کہ ابھی گزرا کہ:

من سبک رو ہم گراں جاں نیستم
صد نشاں پیداست پنہاں نیستم

تک جملہ (اٹھانوے) اشعار اوّلین طباعت اور نئی اشاعت میں ایک ہیں۔ قدیم اشاعت متاخر ایڈیشنوں سے دو موقعوں پر ایک ایک لفظ کی خفیف ترمیم میں مختلف ہے۔ اگرچہ یہ کوئی بہت اہم اختلاف نہیں ہے مگر اس کو نظر انداز کیا جانا بھی قرین مصلحت نہیں۔ اس ترمیم و تغیر کی تفصیل اس طور پر ہے۔

پہلی اشاعت میں درج ذیل شعر کے الفاظ یہ ہیں:

اولیا را گر گرامی داشتیم
نزپئے رومی و جامی داشتیم

متاخر طباعتوں کے دوسرے مصرع میں جامی کے بجائے شامی تحریر ہے۔ اس کے بعد درج شعر قدیم اشاعت میں اس طرح ہے:

از برائے آں کہ ایں آزاد گاں
در رہ حق جاں بجاناں داد گاں

اس شعر کے دوسرے مصرع میں بھی ایک معمولی سی ترمیم ملتی ہے۔
متاخر اشاعتوں میں "دررہ حق" کی جگہ "ازرہ حق" قلم بند کیا گیا ہے۔
اس برائے نام اختلاف کے علاوہ ابتدائی ۹۸ اشعار میں کوئی اور
اختلاف کتابت ناچیز کی نظر میں نہیں آیا۔

زیر اشاعت میں غالب کے اس منظومہ یا مثنوی کے لیے کوئی عنوان
درج نہیں۔ اس کو ترجمہ تحریر مولوی محمد سالم سے یاد کیا گیا ہے۔ یہ
طباعت کل گیارہ صفحات پر مشتمل ہے۔ پہلا صفحہ ٹائٹل کے لیے
وقف ہے۔ دوسرے تیسرے صفحہ پر تمہید یا حرف آغاز درج ہے
چوتھے صفحہ سے منظومہ کا متن شروع ہوا ہے اوسط خط کا مناسب قلم
ہے۔ صفحہ ۴ پر پہلی سطر میں پوری بسم اللہ تحریر ہے۔ پھر دو کالمی صفحہ
ہے۔ اس صفحہ پر بارہ اشعار کے لیے جگہ نکلی ہے۔ اس کے بعد صفحہ ۵
سے صفحہ ۱۰ تک فی صفحہ ۱۳ اشعار کتابت کیے گئے ہیں۔ آخری
گیارھویں صفحہ پر کل گیارہ شعر درج ہیں۔ آخری شعر دو کالمی ترتیب
کے بجائے ایک کالمی کتابت میں دو سطر میں لکھا ہے۔ اس شعر کی
دائیں جانب آڑے قلم سے "کتبہ المذنب محمد بخش" اور بائیں طرف
اسی انداز پر "۱۲۶۸ھ" تحریر ہے۔ اس کے بعد ایک مربع نما خانہ
ہے۔ اس میں تمام شد درج ہے۔ یہ اس اشاعت کی آخری تحریر ہے۔
اس کے بعد کا صفحہ جو ترتیب کی رو سے بارھواں ہونا چاہیے بالکل سادہ
اور ہر قسم کی تحریر و اندراج سے معرّیٰ ہے۔

درج بالا پورا مضمون جناب نورالحسن راشد کاندھلوی صاحب کے مقالہ مشمولہ "آج کل"
اپریل ۱۹۹۰ء سے اخذ کیا گیا ہے۔ اس سے یہ قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ اس مثنوی کی نیو
رکھنے میں (جیسا کہ مولانا حالی نے لکھا ہے اور عام طور پر مشہور ہے) مولانا فضل حق خیر آبادی
کوئی حصہ نہیں ہے۔ ہاں مثنوی کی روایت اوّل کے ۱۰۱ اشعار میں سے ۳ شعر حذف کر کے
۳ شعر بڑھانے کا عمل، اگر مولانا فضل حق خیر آبادی کی شہ پر روا رکھا گیا ہو تو ہو۔ مگر

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ۳ اشعار قلم زد کرنے اور ۳۰ اشعار کا اضافہ کرنے میں بھی مولانا فضل حق کا ہاتھ نہیں کیوں کہ ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو شہر دہلی واپس انگریزی فوج کے قبضے میں آیا۔ گویا ۱۸ ستمبر ۱۸۵۷ء تک جب کہ بہادر شاہ ظفر شہنشاہ ہندوستان تھا، غالب سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ شعر:

بردعاے شہ، سخن کوتاہ باد
تا خدا باشد بہادر شاہ باد

مثنوی سے خارج کر دیا جائے۔ پھر یہ بھی تو دیکھیے کہ اگست ۱۸۵۲ء اور ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کے درمیان مولانا فضل حق خیر آبادی دہلی میں رہے ہی کب [۲] تھے۔ وہ رام پور میں آٹھ سال ملازم رہ کر ۱۸۴۳ء میں یہیں سے لکھنؤ چلے گئے اور شاہ اودھ کی معزولی تک وہیں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۸۵۶ء میں جب واجد علی شاہ گرفتار ہو کر لکھنؤ سے خارج کیے گئے تو مولانا لکھنؤ چھوڑ کر الور آ گئے اور بقول خود ۱۴ راگست ۱۸۵۷ء تک وہیں رہے۔ ۱۵ راگست ۱۸۵۷ء کو دہلی کے لیے روانہ ہوئے۔ مہینہ بھر دہلی میں رہے۔ وہاں زبردست انتشار کا عالم تھا۔ اس لیے وہاں سے بقول خود ۱۹ ستمبر یا ۲۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو "خدا پر بھروسہ کر کے بیوی بچوں کو ساتھ لے کر" الور کے لیے چل کھڑے ہوئے۔ اس کے بعد مولانا ۴ سال تک (انتقال ۲۰ راگست ۱۸۶۱ء) مصائب میں مبتلا رہے اور کبھی دہلی نہ آ سکے۔

یہ شعر۔ ع "بردعاے شہ......" دیوان غالب فارسی مطبوعہ ۱۸۴۵ء (مثنوی سرمۂ بینش) میں شامل ہے۔ [۳] لہٰذا قابل غور بات یہ ہے کہ ۱۸۴۵ء کا چھپا ہوا یہ شعر ۱۸۵۲ء کی مثنوی میں کیوں شامل کیا گیا؟ میری رائے میں غالب نے مولانا محمد سالم کی تحریر کا منظوم ترجمہ دل جمعی سے نہیں کیا تھا اس لیے شاہ کی مدح میں پہلے ہی کا کہا ہوا شعر آخر میں چسپاں کر کے فراغت پائی مگر جب اکتوبر ۱۸۵۸ء میں بہادر شاہ ظفر کو جلا وطن کر دیا گیا تو غالب نے خود یا کسی کے کہنے پر اس مثنوی پر نظر ثانی کی اور تین شعر حذف کر کے اور تیس شعر بڑھا کر پوری مثنوی چھپا لی۔ پھر کسی توضیح کے بغیر اپنے کلیات فارسی مطبوعہ ۱۸۶۳ء میں شامل کر لی۔ [۴]

حواشی

(۱) پورا عنوان یہ ہے "غالب کا منظومہ: ترجمہ تحریر مولوی محمد سالم، یا مثنوی نموداری شانِ نبوت وولایت۔ وجہ تالیف، اوّلین ترتیب اور پہلی اشاعت۔"

(۲) لیکن یہ ثابت ہے کہ وہ وقفے وقفے پر چند دنوں کے لیے دہلی جایا کرتے تھے جیسا کہ "باغ دودر" میں غالب کے ایک خط بنام تفضل حسین سے مولانا فضل حق کا دہلی میں دو ہفتہ قیام کرکے ۳ ربیع الثانی ۱۲۷۰ھ (۳ جنوری ۱۸۵۴ء) کو رام پور روانہ ہونے کا ذکر ہے۔

(۳) اس شعر کا دوسرا مصرع "تا خدا باشد بہادر شاہ باد" مہر نیم روز مطبوعہ ۲۸ نومبر ۱۸۵۴ء میں بھی شامل ہے۔

(۴) نیز دیکھیے (الف) مضمون حنیف نقوی دیوان اردو اپریل ۱۹۹۱ء، ص ۵۔ "غالب کی چھٹی فارسی مثنوی"، (ب) جواب از: مولانا نور الحسن ارشد کاندھلوی۔ ایوان اردو، جون ۱۹۹۲ء، ص ۶۔

غالب، ارسطو جاہ

نسخۂ ارسطو جاہ، مہرِ نیمروز

غالب اپنے خط[۱] بنام جواہر سنگھ جوہر مورخہ ۲۷؍اپریل ۱۸۴۳ء میں لکھتے ہیں:

"...... اگر بجویند یک جلد دیوان بشما فرستم تا آں را از جانبِ من بہ ہمایوں خدمت حضرت مولانا پیش کشند و نقشِ ارادت مرا بکرسی نشانند .... سخن در آں دیار بہرور بزند و شرف روزگار خورد ر اں سخند کہ دامن حضرت مولوی معنوی دامت برکاتہ محکم گیرند۔ باللہ ایں یگانۂ روزگار در جوانمردی و مردمی آیتے از آیاتِ پروردگار است۔ حیف کہ ورقے از گفتار شاہوارش بمن ارمغاں نفرستادید۔ شما را بجان من سوگند کہ چوں ایں نامہ بشما رسد، پس ازاں کہ خواندہ باشید در آستیں نہید و بنظر گاہ آں والا نظر یعنی مولوی سید رجب علی خاں بہادر برید و سلامِ من باجہان جہانِ شوق و عالم عالمِ آرزو باز گوئید و ایں ورق را بنظر گاہ التفات آں مخدوم قدسی صفات در آورید و آں خواہید کہ سر تا سر فرو خوانند تا پایۂ من در ارادت و عبودیت باز دانند..... تو نوشتہ ای کہ مولوی سید رجب علی خاں بہادر آئین حیدر پرستی و حیدر ستائی دارد، گوئی را بدست وے فروختی و دولم را بنور مہر وے افروختی، دانی کہ بندۂ علی ابن ابیطالبم...... و ہر کہ را اے شنوم

کہ بندہ او ست خداوند خود ش ے دانم و تن بہ بندگیش ے وہم......"

اس لمبے خط سے جو اقتباسات اوپر دیے گئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

کہ تمھارے (جواہر سنگھ جوہر کے) کہنے پر ایک دیوان (فارسی مطبوعہ ۱۸۴۵ء) تمھیں بھیجتا ہوں۔ اسے میری طرف سے مولانا (سید رجب ۲ علی) کی خدمت میں پیش کرنا اور میری ارادت کا ذکر کرنا...... اب تمھیں اس دریا میں در در ٹھوکریں کھانے کی ضرورت نہیں۔ اس کو خوش بختی سمجھو اور مولوی رجب علی کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہو۔ قسم خدا کی یہ یگانۂ روزگار عالی حوصلگی اور انسانیت میں پروردگار کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے افسوس کہ تم نے اُن کی گفتار شاہوار سے کچھ بطور تحفہ مجھے نہ لکھ بھیجا۔ تمھیں میری سوگند کہ جب یہ خط ملے، پڑھنے کے بعد ایک رومال میں لپیٹ کر مولوی صاحب کے پاس لے جانا اور میرا سلامِ شوق پہنچانا اور اسے ان کی نظر سے گزارنا۔ وہ میرے خط کا لفظ لفظ پڑھیں تاکہ انھیں معلوم ہو کہ مجھے ان سے کس درجہ ارادت و عبودیت ہے...... تم نے لکھا ہے کہ مولوی صاحب حضرت علی کے ماننے والے ہیں، تو اس بات نے گویا مجھے ان کا بندۂ بے دام بنا دیا۔ میں بندۂ علی بن ابی طالب ہوں اور جو ان کا بندہ ہے اسے میں اپنا خداوند سمجھتا ہوں اور اس کی بندگی میں اپنی جان دے دیتا ہوں......"

جب یہ خط لکھا ہے غالب پچاس سال کی عمر کو پہنچ رہے تھے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے مولوی رجب علی اور غالب کے تعلقات ایک زمانہ پہلے سے تھے اگرچہ مولوی صاحب کے نام کے خطوں میں کوئی خط اس تاریخ سے پہلے کا مجھے نہیں ملا۔

مولوی سید رجب علی انگریزی سرکار کے زبردست وثیقہ تھے۔ ۱۸۵۷ء کی سعی آزادی میں وہ انگریزوں کی طرف داری میں مرزا الٰہی بخش کے دوش بدوش نظر آتے ہیں اور "قوم کشی اور وطن فروشی کی انتہائی مکروہ تصویر پیش" کرتے ہیں۔ بقول صاحبِ بزمِ غالب ۳

ان کا مختصر احوال یہ ہے:

"......رجب علی ۱۸۰۶ء میں ضلع لدھیانہ کے ایک قصبہ تکونڈی میں پیدا ہوئے تھے۔ جب ان کی عمر دس برس کی ہوئی، ان کا خاندان وہاں سے جگراؤں منتقل ہو گیا۔ جس کے بعد ۱۸۱۸ء میں وہ حصولِ تعلیم کے لیے لاہور بھیجے گئے۔ جہاں اُنھوں نے حکیم سید خیر شاہ لاہوری اور حکیم ملا مہدی خطائی سے مختلف علم و فنون میں استفادہ کیا۔ بعد ازاں ۱۸۲۵ء میں دہلی کالج میں داخل ہو کر وہیں ریاضی کے مدرس ہو گئے، لیکن ان کی یہ مدرسی زیادہ دنوں نہیں چلی، اُنھوں نے مدرسی کو ترک کر کے ہوشنگ آباد اور پھر بھوپال کا قصد کیا اور محکمہ فتاویٰ شرعیہ میں ملازم ہو گئے۔ ۱۸۳۳ء میں اچانک بھوپال کا قیام ترک کر کے وطن کی راہ لی اور سردار فتح سنگھ کے مصاحبوں میں شامل ہو گئے۔ اسی کے چار ماہ بعد ان کو جان رسل کلارک نے انبالہ میں اپنا منشی بنالیا۔ ۱۸۵۳ء میں انگریزوں نے ان کی بہتر کارکردگی سے متاثر ہو کر جگراؤں کے کچھ علاقے بطور جاگیر دیے۔ اسی دوران ہنری لارنس کے ساتھ راجپوتانہ کا بھی دورہ کیا۔ غالب نے ۱۲ مئی ۱۸۵۵ء کو منشی جواہر سنگھ کے نام ایک خط لکھا ہے۔

"مولوی رجب علی نے دہلی پہنچ کر کچھ دنوں قیام کیا، پھر جودھپور روانہ ہو گئے جہاں ایجنٹ راجستھان کے دفتر میں ان کا بڑا لڑکا ملازم ہے، روانہ ہوتے وقت ان کا چھوٹا لڑکا اور چھوٹا بھائی بھی ان کے ساتھ تھا، وہ واپس لوٹے تو دونوں ان کے ساتھ نہیں تھے۔ غالباً ان کو ایجنٹ راجستھان کے سپرد کر دیا ہے تاکہ ہر ایک کام سے لگ جائے......" رجب علی نے دہلی میں اس قیام کے دوران علم الکلام کے منتہی مولوی حیدر علی سے مولوی صدر الدین آزردہ کے بالمواجہ مناظرہ بھی کیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے دوران ان کو کمانڈر ان چیف کا

میر منشی بنایا گیا۔ ان کی خدمات کے صلہ میں ان کو پانچ ہزار روپے نقد اور ارسطو جاہ اور خان بہادر کے خطابات دیے گئے[4] ...... [مقامات مقدسہ کی زیارت (عراق و عرب)] سے واپس آنے کے چند سال بعد ۱۸۷۹ء میں انتقال کیا......"

اس سے ظاہر ہے کہ ۱۸۲۵ء (قیام دہلی) اور ۲۷ را پریل ۱۸۴۷ء کے مابین کسی زمانے میں غالب اور مولوی صاحب میں شناسائی ہوئی ہوگی۔ شاید ۱۸۳۳ء سے کچھ عرصے پہلے، جب کہ وہ بھوپال میں مقیم تھے۔ وہاں سے وطن (پنجاب) آتے جاتے دہلی میں قیام ہوتا ہوگا۔ وہیں کہیں ملاقات بھی ہو گئی ہوگی۔ جب ۱۸۵۷ء میں مولوی صاحب کی خدمات کے اعتراف میں انگریزی سرکار نے انھیں خطابات سے نوازا اور وہ مولوی رجب علی سے "ارسطو جاہ خان بہادر مولوی سید رجب علی" بن گئے تو غالب نے اپنے ذاتی مفاد کے پیش نظر ان سے ارتباط اور بھی بڑھالیا۔ جس کا ثبوت ان کے خطوں سے مہیا کیا جاسکتا ہے۔

غالب نہ ہی مخبر پیشہ تھے نہ اُنھوں نے کبھی کسی ایسی سازش میں حصہ لیا تھا جو اُن کے ملک کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی تاہم اُن کی معزز سے معزز تر بننے کی شدید خواہش اُنھیں اکثر چاپلوسوں کے کٹہرے میں کھڑا کردیتی تھی۔ یوں بھی وہ درباروداری کا زمانہ تھا۔ وہ ۱۸۵۷ء سے پہلے بادشاہ اور انگریزی حکام کی چاپلوسی کرتے رہے اور ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی حکومت کی۔ باوجودیکہ شاہ ظفر کا دربار "سنجر اور ملک شاہ، یا جہانگیر اور شاہجہاں" کا دربار نہ تھا، تاہم وہ چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح مستقل طور پر ان کی رسائی شاہ ظفر تک ہو جائے۔ آخر کار میاں کالے صاحب (شاہ ظفر کے پیر) اور حکیم احسن اللہ خان (مدار المہام) کی سفارش سے غالب کو بہادر شاہ ظفر نے خاندانِ تیموری کی تاریخ لکھنے پر مامور کردیا۔ دیکھیے اس خوش گوار واقعے کا ذکر وہ کیسے شاعرانہ اہتمام سے کرتے ہیں۔ ذیل کا اقتباس نسخۂ ارسطو جاہ (پوری کیفیت آگے آئے گی) سے لیا گیا ہے:

"روزی بود فیروز و صبحی دل افروز باد در وزیدن و سبزہ در جنبیدن بلبل بہ نوا خوانے و زاہد بسبحہ گردانی رہ نوردان بار بربستہ و شبگردان پای بدامن شکستہ۔ روز از خجستگی بہ سعد اکبر نامزد و بہ پنجشنبہ نامور آمدہ[5]

وبست وسیوم شعبان سال[6] ہزار و دو صد و شصت و شش ہجری با چہارم جون سال ہزار[7] و ہشتصد و پنجاہ عیسوی برابر آمد۔[8] مہر در خرگاہ ماہ میہمان وماہ از نشیمن زہرہ میہمان را مہر گرزان کیوان تحمل در گام تیجی دیر بجیس بہ سنبلہ در خراش مریخ دراسد بانا ہید و سازو عطار و در جوزا بہ تنہائی شادمان شہنشاہ بشکوہی کہ چنداری آفتاب ست در بیت الشرف براورنگ نشستہ و من بہ نشاطی کہ گوئے عطارد ست در تقسیم رو بروایستادہ کارپردازان شاہی بفرمان حضرت ظل اللّٰہی بہ خلعت خانۂ خاصم بردند و قامتم را بہ خلعت شش پارچہ آراستہ بسلام گاہم آوردند خداوند دنیا ودین بدان دست بخشش آئین کہ کف آں دست ژرف[9] دریائیست کہ ہفت دریا کف اوست جگر گوشہائی معدن یعنی جیغہ وسر پیچ بسرم بست ورگ[10] جان ابر نیساں یعنی مالای مروارید بگردنم آویخت، چاوش فرخ سروش گہرہائی تراویدہ رگ ابر خامۂ شاہ انجم[11] سپاہ برگوشۂ بساط بارگاہ افشاند و غالب سخن سرای را نجم الدولہ و دبیر الملک ونظام جنگ خواند بمحوای الاسماءُ ینزلُ مِنَ السّماءِ[12] بدین مہر خوان کہ از خرشید ذرہ پرورپیا فتم خود راچون گویم کہ با آفتاب ہر آئینہ یا عطارد برابر یافتم توقیع خدمت تاریخ نویسی سلاطین تیموریہ بنام من نگاشتند......"

[ایک دن تھا فتح مندی کا ایک صبح تھی دل کو روشن کرنے والی۔ ہوا کا چلنا، سبزے کا لہلہانا، بلبل راگ الاپتے ہوئے اور زاہد تسبیح پھرتے ہوئے، (دن کے) راہ روختِ سفر باندھے ہوئے اور رات کے مسافر (شب بھر چل کر بوقتِ صبح) تھک ہار کر سوئے ہوئے (غرضے کہ عجیب منظر تھا) یہ دن مبارکی کی وجہ سے سعد اکبر کے نام سے جانا گیا اور پنجشنبہ مشہور ہوا اور ۲۳ شعبان ۱۲۶۶ھ تھا جو مطابق ہے ۴ جون[13] ۱۸۵۰ء کے سورج، چاند کے خیمے (برج ثور۔ آسمانی برج جس کی شکل گائے کی ہوتی ہے) میں میہماں تھا اور چاند زہرہ کے

نشیمن (برج حوت۔ بارہواں برج آسمانی) سے اس میہمان (سورج) کو نگاہِ مہر سے دیکھ رہا تھا۔ کیوان (ستارۂ زحل) برج حمل میں گامزن اور برجیس (مشتری) برج سنبلہ میں چہل قدمی میں محو تھا، مریخ (منگل) برج الاسد میں زہرہ کارساز تھا اور عطارد (بدھ) جوزا (برج آسمانی) میں تنہائی پر خوش تھا۔ شہنشاہ ایسی شان و شوکت کے ساتھ کہ گویا آفتاب ہے، بیت اشرف میں تخت پر جلوہ فگن تھا اور میں اس خوشی کے ساتھ کہ گویا خود عطارد (بدھ) ہوں صمیم دل سے ان کے روبرو کھڑا تھا۔ شاہی کارکن بادشاہ کے حکم سے مجھے خلعت خانۂ خاص میں لے گئے اور میرے بدن کو شش پارچہ خلعت سے سجا کر سلام گاہ میں لے آئے۔ دنیا و دیں کے مالک نے اس دست بخشش آئیں سے کہ جس کی ہتھیلی ایسا دریا ہے کہ سات دریا اس کا جھاگ ہیں، کان کے جگر گوشے یعنی جیغہ اور سرپیچ میرے سر پر باندھے اور رگِ جانِ ابرِ نیساں یعنی موتیوں کی مالا میرے گردن میں ڈالی اور نقیب مبارک سروش نے شاہِ انجم سپاہ کے ابر خامہ کی رگ سے ٹپکے ہوئے موتی بساطِ بارگاہ کے گوشے پر بکھیر دیے اور غالب سخن سرا کا نام نجم الدولہ دبیر الملک و نظام جنگ کے خطابات کے ساتھ پڑھا...... اس خطاب سے جو میں نے خرشید ذرہ پرور سے پایا کیسے کہوں کہ خود کو ہر طرح آفتاب کے ہم پلہ اور عطارد کے برابر محسوس کیا۔ بادشاہ نے تاریخ سلاطین تیموریہ لکھنے کی خدمت کی مہر میرے نام پر ثبت کردی......"]

قصہ کوتاہ غالب ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو تاریخ سلاطین تیموریہ [۱۴] (تاریخ تاجداران تمر خانیہ [۱۵]) لکھنے پر مامور ہوئے۔ امیر تیمور سے لے کر حکمرانِ عہد یعنی شاہ ظفر تک کا حال لکھا جانا قرار پایا۔ گیارہ دن بعد "اسعد الاخبار" آگرہ جو ہفتہ وار چھپتا تھا، ۱۵ جولائی ۱۸۵۰ء کے شمارے میں خبر دیتا ہے۔ [۱۶]

"ان دنوں شاہ والیں پناہ نے جناب معلی القاب مرزا اسد اللہ خاں غالب کو بہ فرط عنایت اپنے حضور طلب کر کے ایک کتاب تواریخ کے لکھنے پر جو تیمور کے زمانے سے سلطنت حال تک ہو، مامور کیا اور اس کے کاتبوں کے خرچ کو بالفصل پچاس روپیہ مشاہرہ مقرر کر کے آیندہ پرورش کا متوقع کیا اور نجم الدولہ، دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ خطاب دے کر چھ پارچہ کا بیش بہا خلعت اور تین رقم جواہر عطا فرمائے۔ یقین ہے کہ تواریخ مذکور ایسی دلچسپ اور متعین عبارت میں لکھی جائے گی کہ ہر ایک اس کے لطف عبارت سے فیض یاب ہوگا......"

مرزا نے تقریباً چھ ماہ میں تیمور سے بابر تک کی سرگزشت مکمل کر لی[17] اور ۲۸ مارچ ۱۸۵۱ء تک ہمایوں کا پورا حال لکھ لیا۔[18] معلوم ہوتا ہے کہ مارچ ۱۸۵۱ء کے بعد ایک لمبے عرصے تک کام رکا رہا کیوں کہ مارچ ۱۸۵۲ء میں اُنھوں نے جو خط مولوی سید رجب علی کو لکھا ہے اس میں بھی اُنھوں نے ہمایوں تک ہی کا حال لکھے جانے کی خبر دی ہے۔ خط کا ضروری حصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔[19]

"فرمان رفتہ است کہ جزوے از تاریخ تاجداران تمر خانیہ، بہ نظر گاہ آں والی ولایت ولائے مرتضوی فرستم۔ ذرہ پرورا، مہر گسترا، آں سواد جزوے چند بیش نیست۔ بعد حمد و نعت و منقبت و مدیح والی عصر و سبب تالیف کتاب کہ آئینِ نامہ طرازانِ ہنگامہ آراست، از کشور کشایان تا نصیر الدین سلطان ہمایوں، سخن راندہ ام، باقی داستان بہ فرداست......"

[(آپ کی طرف سے) حکم ہوا ہے کہ "تاریخ تاجدارانِ تمر خانیہ" کے کچھ حصے ولائے مرتضوی کی ولایت کے والی (مولوی رجب علی[20]) کی نظر سے گزارنے کے لیے بھیجوں۔ ذرہ نواز! مہر گستر! وہ چند اجزا سے زیادہ نہیں ہے۔ حمد و نعت و منقبت اور مدیح والیِ عصر اور

سبب تالیف کتاب جو ہنگامہ آرا مصنفوں کا قاعدہ ہے، کے علاوہ میں
نے فاتحوں سے نصیر الدین سلطان ہمایوں تک کا حال لکھا ہے۔ باقی
داستان آگے لکھی جائے گی.....]

پھر لکھتے ہیں کہ میں یہ اجزا جلد سے جلد بھیج دوں گا۔ اب یہ نہیں معلوم کہ اُنھوں نے یہاں تک کے اجزا مولوی رجب علی کو کب بھیجے تھے۔ ۱۱ جون ۱۸۵۲ء کا ایک خط جواہر سنگھ جوہر کے نام ہے۔[۲۱] لکھتے ہیں:

"...... مسودہ روزنامہ رودداد اورنگ نشینان چغتائیہ بدست ہیرا سنگھ
رواں داشتہ ایم و ہنوز از رسید نقش نشاں نہ یافتہ ایم۔ اگر رسیدہ است
ہنوز مسدود ورنہ از ہیرا سنگھ باز پرس کنند......"

اگرچہ اس خط میں مولوی رجب علی کا نام نہیں اور یہ بھی محض مفروضہ ہے کہ جون ۱۸۵۲ء میں جوہر پنجاب ہی کے اضلاع میں تعینات تھے، تاہم معلوم ہوتا ہے کہ یہ مولوی رجب علی ہی کی فرمائش پر بھیجا ہوا مسودہ تاریخ سلاطین تیموریہ (تاریخ تاجداران تمر خانیہ) ہے جس کا تعارف آج یہاں مقصود ہے۔ اس قلمی نسخے کی ایک عمدہ عکسی کاپی جناب پروفیسر لطیف الزماں خاں (ملتان۔ پاکستان) کی عنایت سے مجھے دستیاب ہوئی اور میرے پیش نظر یہی ہے وہ اصل نسخہ (جو اب پروفیسر لطیف الزماں صاحب کی ملک ہے) جس نے بعد میں "پرتوستان" حصہ اوّل یعنی مہر نیمروز کی شکل اختیار کی۔ اگر یہ نسخہ جون ۱۸۵۲ء کو نہیں بھیجا گیا تھا تو مارچ ۱۸۵۲ء اور جون ۱۸۵۲ء کی درمیانی مدت کا مکتوبہ ضرور ہے کیوں کہ یہی وہ عہد ہے جب ردوبدل ہوا تھا کہ اب تاریخ، ابتدائے آفرینش عالم و آدم سے شروع ہو اور اس نسخے میں متن ابتدائے آفرینش عالم و آدم سے شروع نہیں ہوا ہے بلکہ یہ حال اس میں شامل ہی نہیں ہے۔

اس مخطوطے پر مولوی رجب علی کے کتب خانے کی مہر ہے جو اس طرح ہے۔

۱۲۷۵ رجب علی خان بہادر مہر کتب خانہ سید مولوی

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ مخطوطے پر ۱۲۷۵ھ (۱۱ اگست ۱۸۵۸ء تا ۳۱ جولائی ۱۸۵۹ء) کی مہر کیوں ہے جب کہ مخطوطہ ۱۸۵۲ء (۱۲۶۸ھ) سے مولوی صاحب کی تحویل میں ہے۔ اس کی ایک معقول وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ۱۸۵۷ء تک مولوی رجب علی صرف ایک بارسوخ ہوشیار، قابل اور جگراؤں (پنجاب) کے کچھ نواحی علاقوں کے جاگیر دار تھے۔ مگر ان کا شمار روسائے پنجاب میں نہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں جب وہ انگریزی فوج کے کمانڈر انچیف کے میر منشی بنائے گئے اور ۲۰ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دلی پر انگریزوں کے دوبارہ قبضے کے بعد ان کی وطن فروشی (خدمات) کے عوض انھیں "ارسطو جاہ" اور "خان بہادر" کے خطابات سے نوازا گیا تو ان کا بول بالا ہو گیا اور وہ بڑے رئیسوں میں گنے جانے لگے۔ جس سے ان کی شان و شوکت میں ہمہ جہتی اضافہ ہوا۔ علم دوست تو وہ تھے ہی۔ باقاعدہ ایک کتب خانہ قائم کیا گیا اور یہ سب کرتے کراتے سال بھر اور گزر گیا۔ حتیٰ کہ ۱۸۵۸ء کا اخیر (۱۲۷۵ھ) آگیا۔ کتب خانے کی مہر بنوائی گئی اور جو کتابیں اس میں داخل کی گئیں ان پر یہ مہر ثبت ہوئی۔ آج اسی مہر کے ساتھ یہ مخطوطہ میرے روبرو ہے اور غالبیات کی تاریخ میں ایک نئے باب کے اضافے کا باعث بن رہا ہے۔ میں نے سال مہر ہی کی بنا پر اور فرض کر کے ۱۲۷۵ھ میں مولوی رجب علی کو ارسطو جاہ کا خطاب مل چکا تھا۔ اس مخطوطے کا نام "نسخۂ ارسطو جاہ" رکھا ہے۔

"نسخۂ ارسطو جاہ" ۱۲۲ صفحات پر محیط ہے۔ ہر صفحے پر ۱۵ سطروں کا التزام ہے۔ تمام نسخہ خوش خط نستعلیق میں لکھا گیا ہے۔ کاتب پڑھا لکھا معلوم ہوتا ہے۔ ترقیمہ یا خاتمۃ الطبع شامل نہیں۔ وجہ شاید یہ ہے کہ یہ مخطوطہ ایسی کتاب کی قلمی نقل ہے جو ابھی مکمل نہیں ہوئی۔

ابھی یہ کتاب لکھی جا رہی تھی کہ بادشاہ کی طرف سے حکم ہوا کہ اب حال ابتدائے آفرینش عالم و آدم سے آغاز کیا جائے۔ غالب تاریخ نویسی سے اکتائے ہوئے تھے۔ وہ مان گئے مگر اس طرح کہ اب حکیم احسن اللہ خاں اردو مسودہ بہم پہنچایا کریں گے اور غالب اسے فارسی جامہ پہنا دیا کریں گے۔ چنانچہ جون ۱۸۵۲ء کے بعد حکیم صاحب نے آدم سے چنگیز خان تک کا مسودہ اردو میں مہیا کر دیا جسے غالب نے فارسی میں لکھ کر کتاب میں شامل کر لیا۔ بعد ازاں تقاضوں کے باوجود حکیم صاحب نے مزید مواد مہیا نہ کیا۔ آخر کار غالب نے جو کچھ

بھی لکھا جا چکا تھا۔ اسی کو ایڈٹ کر کے (تفصیل بعد میں آئے گی) کتاب کا نام "پرتوستاں" رکھ دیا اور لکھے ہوئے اوراق کو حصہ اول یعنی "مہر نیمروز" کا نام دے دیا۔ دوسرے حصے کا نام "ماہ نیم ماہ" تجویز کیا تھا مگر اس کے لکھنے کی نوبت کبھی نہ آئی۔ جس حصے کو ایڈٹ کر کے مہر نیمروز کا نام دیا گیا ہے، نسخۂ ارسطو جاہ ، اسی اصل مواد پر مبنی ہے اور آج غالبیات کے شائقین کو اس سے پہلی بار متعارف کرایا جا رہا ہے۔

غالب غیر معمولی تخلیقی اور اختراعی قوت کے مالک تھے اور بے حد معاملہ فہم اور ذہین شخص تھے۔ انھوں نے جس طرح اصل مواد کو "مہر نیمروز" میں ڈھالا ہے وہ عمل بذات خود فنِ تدوین کا عمدہ نمونہ ہے۔ الفاظ، صفحات اور اوراق میں ردوبدل اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ اس نسخۂ ارسطو جاہ کو "مہر نیمروز" کے پیش رو کے طور پر الگ سے مکمل چھاپا جانا چاہیے۔ فی الحال نمونۃً چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔

سب سے پہلے اول اور آخر دیکھیے:

ص ا "آغاز ہر گفتار کہ سرانجام آں در اندیشہ گزرد و سرانجام ہر کار کہ خرد با آغاز آں رو بر و بستایش داور دانائی بخش دارائے سپار دانا بر گزیں دارا نگاہدار نکوست، کہ ہنجار راستی و پیوند درستی بازگشت ہر گونہ ستایش از ہر ستوہاں بسوے اوست (×) ۔ اگر سخن از بلندی سپہر درمیاں اندازند، اندازہ داں داند کہ آں بلندی اساس پایۂ نمود (کیست) واگر مہر را بروشنی ۲۲ انگشت نما سازند کار شناس شناسد کہ ایں روشنی الف صیقل آئینۂ شہود کیست جیغہ جیغہ کردن ابروے ۲۳ ہلال بہ پرتو فشانی ۲۴ ستارہ ہاے شام......"

مندرجہ بالا اقتباس نسخۂ ارسطو جاہ سے ہے۔ یہی نسخۂ ارسطو جاہ کا آغاز ہے اور یہی مہر نیمروز کا، فرق صرف یہ ہے کہ مہر نیمروز کے لیے اوپر کی چوتھی سطر کے "بسوے اوست" اور "اگر" کے درمیان ذیل کے الفاظ بڑھا دیے ہیں:

"زہے بخشایندہ پرتوستاں کشایندہ، مہر نیمروز نمایندۂ ماہ نیم ماہ آرایندہ"

[واہ واہ۔ کیسا بخشنے والا، پرتوستان کھولنے والا، مہر نیمروز (دوپہر کا سورج) دکھانے والا، ماہِ نیم ماہ (چودھویں کا چاند) کی آرائش کرنے والا......]

اب نسخۂ ارسطو جاہ کے آخری دو صفحات ملاحظہ فرمایئے۔

ص ۱۳۱ "کہ ایں فرزانۂ ناز پروردہ بریں جہاں را از آں پنجاہ و یک سال کہ در گلگشت ایں شششدرہ بوستان گزشت بست و چہار سال بفرمان دہے شاہنشے کابل و ہندوستان گزشت در دہلی نو کہ اکنون کہن است خواب گاہش ساختہ اند وایں گنبد کہ سر بہ ستارہ میساید بقول صاحب تاریخ فرشتہ در سال نہصد و ہفتاد وسہ افراختہ اند یہ مستی عدلے دہر زہ گردی افغانان دیگر وگرمی بازار میمون ہنوز بر جاست تا در عہد بادشاہ جواں دولت جواں سال از آنہا چہ سخن زود...... دیدہ وراں بدلفریبی ایں گزیں روش کہ خامہ را در بنان من است اگر بہ برش دید از روش فرسودہ فروتنی داو از دیدہ وراں خواہم از دیدہ وری خواہد بودنہ از فزوں سرے، کالا شناسی راند آں آئین است کہ نکوئی کالای خویش از نظر انداز ند و پر کار کشائی رنہ آن دستور است کہ بہر پیکرے کہ خود کشند عشق نباز ند نگرمانی آن نقش را کہ خود میز واز اعجاز ممنی شمرد، و آذر آن بت را کہ خود می تراشید "نماز نمی برد، یزدان را بندۂ سپاس گزار باشم اگر قلم را بہر جنبش آفرین نگویم واز سخن بہر اندیشہ سپاس نیز یرم رفتار کبک وتذرو دل از دست بردو خرام ایں رعنالعبت رقاص سرمست بکنند۔

ص ۱۳۲ حاشا کہ خرامش کلک بر ورق انسیابیہ دلاویز وذوق انگیز تواند بود، تیراست کہ بسنبلہ در حالت سرمستی قصمم خود نمایانہ بنیاز منتظر اماین پارسی آمیختہ بہ تازی کہ از زمان چیرہ دستی عرب بر عجم در گیتی بدید آمد خسروی گنجینۂ دربستہ بود کہ خامۂ من قفل درش را کلید آمد پر ویز۔

کجاست تا بنگرد کہ دریں رہروے کدام راہ سپردہ ام و بہرام کجاست
تا فرا رسد کہ سخن را از کجا بکجا بردہ ام بیت:

خسر دی بادہ دریں دور اگر میخواہے
پیش ما آی کہ ته جرعہ از جامی ہست"

نسخۂ ارسطو جاہ اس شعر پر ختم ہوتا ہے مگر مہر نیمروز اس سے کہیں پہلے مندرجہ بالا اقتباس کی آٹھویں سطر کے ان الفاظ پر رک جاتی ہے "......از آنجا چہ سخن رود" اور اس کے آگے یہ عبارت اضافہ کر کے کتاب کا خاتمہ بالخیر ہو جاتا ہے:

"ہمانا پر تو فشانی مہر نیمروز در پر تو ستان انجام یافت۔ امید کہ زود تہ دیے ہنگامۂ تابش ماہ نیم ماہ گرم شود......"

نسخۂ ارسطو جاہ اور مہر نیمروز کے اشعار میں بھی ایک گونہ اختلاف ہے۔ ذیل میں وہ اشعار دیے جاتے ہیں جو مہر نیمروز (حصہ اول) میں ہیں مگر نسخۂ ارسطو جاہ میں شامل نہیں:

مطلع

درعدم چہ دار پیدائی سلیماں زاتی
آہ ازیں عالم گرش در چشم موری جاتی

رباعی

اے کردہ بآرایش گفتار بسیچ
در زلف سخن کشودہ راہ خم و پیچ
عالم کہ تو چیز دیگرش میدانی
زاتی است بسیط منبسط دیگر ہیچ

فرد

لفظ و معنی را بدانش و اورس
احترام الدولہ عیسے نفس

فرد

بداں نمط کہ ز آدم محمد است مراد
ز پشت کار تمر خاں بہ تست روی حکیم

مصرع

تا خدا باشد بہادر شاہ باد

بیت

بنام آنکہ گر رنگست در بوست
بغیر از وہم نبود ہر چہ جز اوست

فرد

پشہ کے داند کہ ایں باغ از کے است　　در بہاراں زاد و مرگش در دے است

نظم

ہدریں فصل نہ مستانہ سخن میگزرد
نکتہ ' چند سرایم ز وجوب و امکاں

صور کون نقوش است و ہیولی صفحہ
صفحہ عنقا است چہ گوئی ز نقوش امکان

ہستی محض تغیر نپذیرے و زنہار
حرف، آلان کما کان، ازیں صفحہ بخوان

ہمچناں در حق غیب نمودی دارند
بوجودیکہ ندارند ز خارج اعیان

پرتو لمعہ ندانی کہ بود جز خورشید
موج و گراب نسنجی کہ بود جز عمان

عالم از ذات جدا نبود و نبود جز ذات
ہمچو را ازیکہ بود در دل فرزانہ نہان

نتوان گفت کہ عین است چرا نتوان گفت
صور علمیہ کز علم نیاید بہ عیان

فرد

عقل در اثبات وحدت خیرہ مے گردد چرا　　ہرچہ جز ہستی ست ہیچ ہرچہ جز حق باطل است

مصرع

دانی ہمہ اوست ورندانی ہمہ اوست

مطلع

سخن دوست گراں بود فراواں کردم　　جاں بہ بیعانہ بیاید کہ ارزاں کردم

مصرع

بعد ازخدا بزرگ توئی قصہ مختصر

غزل

حق جلوہ گر ز طرزِ بیانِ محمدؐ است
آری کلامِ حق بزبانِ محمدؐ است

آئینہ دار پرتوِ مہرست ماہتاب
شانِ حق آشکار ز شانِ محمدؐ است

تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است
اما کشادِ آں ز کمانِ محمدؐ است

دانی اگر بمعنیِ لولاک وارسی
خود ہرچہ از حق ست از آنِ محمدؐ است

ہر کس قسم بدانچہ عزیزست میخورد
سوگندِ کردگار بجانِ محمدؐ است

واعظ حدیثِ سایۂ طوبیٰ فرو گزار
کاینجا سخن ز سروِ روانِ محمدؐ است

بنگر دو نیمہ گشتنِ ماہِ تمام را
کاں نیمہ جنبشی ز بنانِ محمدؐ است

ور خود ز نقشِ مہرِ نبوت سخن رود
آں نیز نامور ز نشانِ محمدؐ است

غالب ثنای خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

نظم

زہے نامور پایۂ سرفراز سرا پردۂ خلوتستانِ راز
سررشتہ نازش چون و چند بہ پیچیدہ ہستی بداں پایہ بند
دو گیتی نمایش ز صمکش دمی خود آں صبح را ہر فلک شبنمی
زویز و بپرستاں بہر سرزمیں بود سجدہ آنجا چو سربر زمیں

فرد

چارہ در سنگ و گیاہ و رنج با جاندار بود　　پیش ازاں کاں درر سد ایں را مہیا کردہ ای

مصرع

بہ لیلی ہرچہ ماند عین لیلی ست

مصرع

خود می کند خرام و خود از دست مے رود

فرد

حسرت روے ترا حور تلافی نہ کند　　از تو آخر بچہ اُمید شکیبا باشم

فرد

ذوقیست ہمہ اطفال بگذرم ز رشک　　خار رہت بپاے عزیزاں خلیدہ باد

فرد

دل مایوس را تسکیں بمردن می تواں دادن　　چہ اُمید است آخر خضر و ادریس و مسیحا را

فرد

شوکت از سنگدلی ہاے تو گریہ کہ چو ابر　　گرمی باطنش از آتش سنگ بیدہ است

نظم

خیز تا بنگری بشاخ نہال　　طوطیانِ زمردیں پر و بال

گاہ مرجان و دانہ از منقار　　گہ زبرجد فشاندہ از پر و بال

ہمہ آہنگ ساز و زمزمہ سنج　　ہمہ دستانسرای و پردہ سگال

زاں مسیحی و ماں خضر لباس　　زاں بہشتی و شانِ حور مثال

نشنوی یک ترانہ کش نبود　　شور گلبانگِ دیگر از دنبال

کف زدن ساز کردہ برگ درخت　　رقص آغاز کردہ باد شمال

طوبی و طوطی و نوا و ہوا　　نبود بجز ترنم اطفال

نے کلک من آں نہالستی　　ویں معانی طیور فرخ فال

گفتہ باشی کہ خامہ رقاص　　خنگ نے پارہ ایست ہیچ مبال

نغز گفتی و تن زدم آری   نتواں جست کار ریشه ز تال
نظم انداز نخل بندی کرد   رست سروے بسر زمینِ خیال

فرد

ریزه آں برگ و آں گل افشاند   هم خزاں هم بهار و در گزرست

نظم

شبانگه بوے خوش انگیختن   سحر گه بشرت بر آمیختن
گرفتند پراشیاں سر سوزنی   دهن را کشایند چوں روزنی

مصرع

هر کر انج روز نوبت اوست

فرد

غم چو بهم در افگند دو که مراد میدهد   دولت ذخیره میکند کاه بیاد میدهد

نظم

چه دختر خوش تراز هفتاد فرزند   نکو روے و نکو خوے و خردمند
جم و اسکندر و آئینه و جام   سراپا مردمی آلتغوا نام

فرد

همت اختر ونه چرخ خود آخر بچه کاراند   بر قتل من ایں عربده با یار روانیست

نظم

باز باطراف باغ آتش گل در گرفت   مرغ بر رسم مغان زمزمه از سر گرفت
سبزه براندام خاک حله ز مخمل برید   مهر بدیدار باغ آئینه در زر گرفت
گلبن افسرده را روح بقالب دوید   سبزهٔ پژمرده رانامیه در بر گرفت
دشت بپرکار باد طرح صنم خانه ریخت   باد براطراف دشت صنعتِ آزر گرفت
سرو ببالای سرو طره ز سنبل فگند   گل بتماشای گل دیده ز عبهر گرفت
قامتِ رعنای سرو پردهٔ گلبن درید   عارض زیبای گل دل ز صنوبر گرفت
گرچه گل از بهر زمین تختگی برگزید   لیک بسر هنگیش سبزه سراسر گرفت

بسکه نیامد فرو سر بگهر گشتنش — قطره ز بالا دوی هیئت اختر گرفت
مہر بسودای تاک لمعه زکان بازچید — از زر اصفر گزشت بادۂ احمر گرفت

فرد

یاسم زجانگزای خواہش نجات داد — درد مرا بداغ دوا کرد روزگار

نظم

شہنشاہ دانا دل و دیدہ ور
کہ چوں لعل بودی سراپا جگر
بران شد کہ لشکر فراز آورد
بسوی ختا ترکتاز آورد
زمردان و گردان و گند آوران
بہ جنبش در آورد کوی گران
ازاں رو کہ بایست خونریز شد
منش ہانجون رخشش تیز شد
دلیران ز دشمن کشی دم زدند
ز دم باد بر روی پرچم زدند
ز تاتار تا گرد انگیختند
بہ بنگاہ خانِ ختا ریختند

مصرع

بر تختِ پشت پاز دو بر تاج دست رو

مصرع

تاج برسر نہاد و پاے بہ تخت

نظم

دیگر بدان ادا کہ وزد در بہار باد
دارد بپویہ کلک مرا بے قرار باد

وسعت گر تراوش شبنم ز جوش مہر
گوہر فشاں شود بسر سبزه زار باد

وسعت کز شگرفی آثار نامیہ
بندو حنا ز لاله بدست چنار باد

وسعت کاورد ز رو آورد نوبہار
بی جام و آبگینہ ی بی خمار باد

با محتسب بگوی کہ مستی گناه نیست
زیں پس بجای باده خورد باده خوار باد

از گونا گوں شقایق و از رنگ رنگ گل
زو نقش ہای بوقلموں صد ہزار باد

سنبل چراز غصہ نپیچد بخویشتن
کش جز بہ سبزگی خہد در شمار باد

بنگر قماش سبزه کہ بافدروای خضر
بی آنکہ پود را بجز آرا بہ تار باد

نی باد بلکہ خود دمِ جاں بخش عیسویست
نامش نہاده اند دریں روزگار باد

زاں رو کہ چار سوی جہاں را فرو گرفت
ماند بہ پرچم علم شہر یار باد

اب وہ اشعار دیکھیے جو نسخۂ ارسطو جاہ میں ہیں مگر مہر نیمروز (متداول) سے حذف کر دیے گئے ہیں:

فرد (کلیات غالب فارسی ص ۳۹۹ پر موجود)

نُرد آدم از امانت ہر چہ گردوں برنتافت — ریختے برخاک چوں در جام گنجیدن نداشت

ابیات (چاروں شعر کلیات غالب فارسی کے ص ۴۰۷ پر موجود)

باچنیں ہنگامہ در وحدت نمی گنجد دوئی — مرده را از خویش دریا برکراں انداختہ

نقش بر خاتم ز حرف بی صدا انگیختہ | شور در عالم ز حسنِ بے نشاں انداختہ
جادۂ بیابان راہش بہ فلک راچوں جرس | درگلوی ناقہ ہاے کارواں انداختہ
گلخن افروزانِ داغش ہست گلشن راچو خس | در گزار نالہ آتش فشاں انداختہ

بیت

آسماں پایہ جمس تامس آں قلزم فیض | بادجانش بجہاں تاجہاں جاماند ۲۵

نظم

نبوت در اندیشہ تا نقش بست | نزول و عروجی بہم داد دست
سر آغاز قوسِ نزول آدم است | خدا (کذا) نخستین رسول آدم است
جہاں بود از کارفرما تہی | بآدم کہ دادند فرماندہی
زبہروی آورد اشجار بار | دی آورد د(کذا) گیا پایہ کار
بہ یزدان پرستی شدا و رہنماے | زی گیتی آرای گیتی (کذا) اے

نظم ۲۶

بہ بے برگیم گلفشاں بودن ست | بہ دم سردی آتش زباں بودن ست
ولے تاب در خود نیابم کنوں | صریرِ قلم برنتابم کنوں

ایک اور نمایاں فرق مضامین کے عنوانات میں ہے۔ نسخۂ ارسطو جاہ میں صرف یہ عنوان ملتے ہیں۔

۱	ص ۱	آغاز ہر گفتار...... (آغاز گر بے نام)
۲	ص ۷	زمزمۂ نعت
۳	ص ۱۵	ترانۂ مدح
۴	ص ۱۹	خطاب بہ زمیں بوس
۵	ص ۲۶	انداز فتح الباب وطراز عنوان کتاب
۶	ص ۵۷	نوا بخشی شنیدن بگفتن داستاں جہانگردی وجہاں گیری خسرو مرغ سلاح مہر کلاہ ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ

۷ ص ۸۲ ارزش افزوں خامہ و آمد بہ نگاشتن حال فرخی فال جہانیاں بخت نشاں نصیر الدین محمد ہمایوں بادشاہ غازی

اس کے برعکس سپہر نیمروز میں ذیل کے عنوانات ہیں۔ دونوں میں فرق اظہر من الشمس ہے۔

۱۔ آغاز

۲۔ زمزمۂ لطف

۳۔ ترانۂ مدح

۴۔ خطاب زمین بوس

۵۔ سبب تالیف کتاب و اندازِ فتح الباب

۶۔ آغاز پرتو فشانی سپہر نیمروز در باز نمود پیدائی ظلم شب و روز

۷۔ نشان ہستی آدم

۸۔ پرتو سپہر نیمروز از دارائی ترک ابن یافث

۹۔ پرتو در فراوانی وجود السلطان تا فرشیو۔ پایسنغر خان

۱۰۔ پرتو دیگر در بلندی رایت اقبال تومنہ خان تا عالم آرائی جہانبان برتان بہادر

۱۱۔ پرتو سپہر نیمروز از فروغ گوہر مسیح کا بہ زور تا در خشندگی جوہر تیغ چنگیز خان

۱۲۔ پرتو سپہر نیمروز در وزیدن نسیم نوروزی بہ جنبش پرچم لوای جہان کشائی سپہدی قراچار نویان تا زرین کلاہی و شہنشاہی صاحب قران اعظم امیر تیمور جم حشم

۱۳۔ پرتو سپہر نیمروز در ورق گردانی داستان جہانگردی و جہانگیری خسرو مریخ سلاح سپہر کلاہ ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ

۱۴۔ پرتو سپہر نیمروز در نموداری حال فرخی فال جہانیان بخت آشیاں نصیر الدین محمد ہمایوں بادشاہ غازی۔

استدراک

اب پروفیسر لطیف الزماں خاں (ملتان، پاکستان) نے نسخۂ ارسطو جاہ کے بارے میں مزید معلومات بہم پہنچائی ہیں جو فوٹو کاپی میں نہیں آسکتی تھیں۔ وہ یہ ہیں:

۱۔ کاغذ معمولی ہے۔ رنگ میلا ہے، نیا ہو گا تو بادامی رہا ہو گا۔
۲۔ جگہ جگہ سے کیڑوں نے کھالیا ہے مگر الفاظ صاف پڑھے جاتے ہیں۔
۳۔ خط معمولی ہے مگر رموز و اوقاف کا خیال رکھا گیا ہے۔ صاف ہے۔
۴۔ ک کا اوپری مرکز سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے اور واو عاطفہ بھی سرخ روشنائی میں لکھا ہے۔ زیر، زبر، پیش بھی سرخ ہیں۔ کہیں کہیں سرخ روشنائی استعمال نہیں بھی کی گئی۔
۵۔ رسول ﷺ اللہ کا نام جہاں آیا ہے۔ سبز روشنائی سے لکھا گیا ہے۔
۶۔ یاے معروف یاے مجہول میں فرق روا نہیں رکھا گیا۔
۷۔ گزشت اور گزاشت کو ہر جگہ ذال سے لکھا گیا ہے۔
۸۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بعض جگہ غالب نے خود تصحیح کی ہے مگر وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔

حواشی

(۱) باغِ دودر۔ تصحیح و تحقیق وزیر الحسن عابدی۔ لاہور، ص ۱۱۶

(۲) رجب علی شاید شاعر بھی تھے۔ ان کے نام کے ساتھ علی تخلص لکھا ہوا میں دیکھا ہے۔

(۳) بزمِ غالب۔ عبدالرؤف عروج ۱۹۶۹ء۔ ص ۱۶۱

(۴) (الف) اسپیر (P. Spear- Twilight of the Mughals- Page 217)

حکیم احسن اللہ خان کے حوالے سے لکھتا ہے "۱۲ بجے کے بعد مرزا الٰہی بخش آیا۔ اس نے ہڈسن صاحب کا دستخط شدہ پاس (پروانۂ راہداری۔ اس وقت بادشاہ مقبرے میں پناہ گزیں تھے) دکھا کر کہا اگر آپ سب لوگ ہتھیار ڈال دیں اور بادشاہ پالکی میں چلیں تو انھیں (بادشاہ کو) ملکہ کے محل میں رہنے کی اجازت دے دی جائے گی...... اور کہ مولوی رجب علی ۲۵ سکھ سواروں کے ساتھ (انگریزوں کی طرف سے) مقبرے میں پہنچ چکا ہے...... مولوی (رجب علی) نے عرب سرائے کے باہر بادشاہ کی خدمت میں نذر گزرانی اور اس کا یقین دلایا۔ جیسے ہی بادشاہ کی پالکی ہمراہیوں سمیت شہر کے پاس پہنچی اور پالکی کو نیچے رکھا تو مولوی رجب علی نے ہڈسن کو اطلاع کی کہ اب آپ خوشی سے (بادشاہ کو حراست میں لانے کے لیے) بذاتِ خود تشریف لائیں۔"

(ب) ص ۲۵۳ پر اسپیر نے فین شا (F.C.Fanshawe- Delhi Past and Present) کے حوالے سے لکھا ہے کہ مولوی رجب علی دلّی میں برطانوی خفیہ محکمے کا سربراہِ اول تھا۔

(۵) مہرِ نیمروز (مسودہ اول) سے خارج ہیں۔

(۶) مہرِ نیمروز (مسودہ اول) میں ایک ہزار۔

(۷) مہرِ نیمروز (مسودہ اول) میں ایک ہزار۔

(۸) مہرِ نیمروز (مسودہ اول) سے خارج ہیں۔

(۹) مہرِ نیمروز (مسودہ اول) سے خارج ہیں۔

(۱۰) مہر نیمروز (متداول) حائل مروارید۔

(۱۱) مہر نیمروز (متداول) پروین۔

(۱۲) مہر نیمروز (متداول) سے خارج ہیں۔

(۱۳) غالب سے یہ سہو ہوا پنجشنبہ ۲۳ شعبان ۱۲۶۶ھ مطابق ہے ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کے۔

(۱۳) بحوالہ نسخۂ ارسطو جاہ (مکتوبہ تقریباً مئی رجون ۱۸۵۲ء)

(۱۵) بحوالہ مکتب بنام ارسطو جاہ مولوی رجب علی۔ مارچ ۱۸۵۲ء

(۱۶) اردو۔ اپریل ۱۹۳۵ء۔ ص ۱۹۳، اب سے آدھی صدی پہلے کے اردو اخبار، از: برجموہن دتاتریہ کیفی۔

(۱۷) خط بنام نبی بخش حقیر (نادرات غالب کراچی ص ۸) مورخہ ۲ جنوری ۱۸۵۱ء

(۱۸) خط بنام نبی بخش حقیر (نادرات غالب کراچی ص ۱۱) مورخہ ۲۸ مارچ ۱۸۵۱ء

(۱۹) کلیات نثر غالب۔ ص ۱۱۳

(۲۰) مولوی سید رجب علی شیعہ تھے۔

(۲۱) کلیات نثر غالب۔ ص ۱۲۰

(۲۲) میرا خیال ہے چوں کہ آغاز کی عبارت میں "مہر"، "ہلال" اور "پرتو" جیسے الفاظ پہلے ہی سے موجود تھے۔ اس لیے غالب نے پورے پروجیکٹ کا نام "پرتو" کے حوالے سے "پرتوستان" رکھ دیا ہوگا اور "مہر" کے حوالے سے "مہر نیمروز" اور "ہلال" (تیسری تک کا نیا چاند) کا دوسرا سرا "ماہ نیم ماہ" (چودھویں کا چاند) ہی ہوتا ہے۔ غالب جیسے تخلیقی ذہن رکھنے والے کے لیے ایسے الفاظ سے فائدہ اٹھانا معمولی بات ہے۔

(۲۳) ایضاً

(۲۴) ایضاً

(۲۵) یہ شعر کلیات غالب فارسی میں موجود ہے۔ (ص ۲۷۶)

(۲۶) نسخۂ ارسطو جاہ میں اس نظم کے کل ۱۱ شعر ہیں۔ ۹ شعر "مہر نیمروز" (متداول) میں شامل کیے گئے اور یہ دو شعر حذف ہوئے۔

غالب کی زندگی میں مہرِ نیمروز کی اشاعتیں

غالب ۱۵ ستمبر ۱۸۵۳ء کے خط بنام نبی بخش حقیر میں لکھتے ہیں۔[1]

"میں نے اب کے عید کو قصیدہ نہیں لکھا۔ ایک مجلد اس تاریخ کا تمام کر کر وہ نذر کیا۔

اس کا حال سنیے کہ وہ صورت جو پہلے تھی۔ وہ نہیں رہی آگے آغاز امیر تیمور کے حال سے تھا اب شروع تحریر آفرینش عالم و ظہور آدم سے ہے۔ میں نے کتاب کا نام "پرتوستان" رکھا اور دو مجلد پر منقسم کیا۔ پہلا مجلد ابتدائے عالم سے حضرت نصیر الدین ہمایوں تک اس کا نام "مہر نیمروز" رکھا۔ دوسرا مجلد جلال الدین اکبر کے حال سے حضرت والیِ عصر تک۔ اس کا نام "ماہِ نیم ماہ"۔ سو وہ "مہر نیمروز" تمام ہوا اور نذرِ حضور (بہادر شاہ ظفر) کیا۔"

اب مختصراً "مہر نیمروز" کی توقیت[2] بھی ملاحظہ کر لیجیے۔

۴ جولائی ۱۸۵۰ء: مرزا غالب خاندانِ تیموری کی تاریخ لکھنے پر مقرر ہوئے۔ شاہ ظفر کا حکم تھا کہ صرف خاندانِ تیمور کی تاریخ یعنی امیر تیمور سے لے کر حکمران عہد تک کے حالات لکھے جائیں۔

جنوری ۱۸۵۱ء: تیمور سے بابر تک کی سرگزشت مکمل۔

مارچ ۱۸۵۱ء کے آخر تک ہمایوں کی جلاوطنی اور واپسی تک کا بیان مکمل۔

مارچ ۱۸۵۲ء تک کام رُکا رہا۔

مارچ تا جون ۱۸۵۲ء: ہمایوں کے سال کے بعد مرزا نے حکیم احسن اللہ خاں سے کہہ دیا کہ مجھ سے انتخاب بحالات ممکن نہیں۔ آپ مسودہ اردو میں لکھوا کر میرے پاس بھیج دیا کیجیے۔ میں اسے فارسی کردوں گا۔ حکیم صاحب نے اُسے قبول کیا۔ اب حال بھی ابتدائے آفرینش عالم و آدم سے حکمرانِ عہد تک لکھتا تھا۔ چنانچہ اسی انداز کا مسودہ مرزا کے پاس بھیجا۔ گویا اب مرزا کو ایک اور کتاب لکھنی پڑی۔ اُنھوں نے لکھ کر آدم سے لے کر چنگیز خاں تک کا مسودہ (کیوں کہ یہیں تک کا مسودہ حکیم صاحب نے اردو میں بھیجا تھا) حکیم صاحب کے حوالے کیا۔ اس پر ایک چھوٹا سا دیباچہ لکھا اور عبارت کا انداز بھی بدل دیا۔

جون ۱۸۵۲ء تا ۱۰ر اپریل ۱۸۵۳ء: اس مدت میں اس تاریخ نویسی پر کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔ کیوں کہ تقاضے کے باوجود حکیم صاحب نے اردو مسودے کے مزید اوراق مہیا نہیں کیے۔

اگست ۱۸۵۳ء: کتاب مکمل ہو گئی۔

(میرے کتب خانے میں "مہر نیمروز" کا ایک نسخہ جمعہ ۱۷ ذیقعدہ ۱۲۶۹ھ (۱۱ر ۱۲ر اگست ۱۸۵۳ء) کا قلمی موجود ہے۔ جس کے حاشیوں پر کم از کم ۵۵ عبارتیں غالب کے قلم سے ہیں۔)

ستمبر ۱۸۵۳ء: عید قرباں پر حضور شاہ میں نذر کی گئی۔

۲۴ ستمبر ۱۸۵۴ء تا ۱۳ ستمبر ۱۸۵۵ء: فخر المطابع سے حسب الحکم مرزا فخرو ولی عہدِ ظفر ۱۲۷۱ھ شائع ہوئی بار اوّل۔

میرے یہاں وہ نسخہ موجود ہے جو غالب نے نواب ٹونک کو بھیجا تھا۔ وہ نسخہ ۱۷ مارچ ۱۸۵۵ء کو نواب ٹونک کے کتب خانے میں داخل ہوا۔ اس سے ظاہر ہے کہ "مہر نیمروز" پہلی بار ستمبر ۱۸۵۴ء اور ۱۷ مارچ ۱۸۵۵ء کی درمیانی مدت میں طبع ہوئی۔

۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء: خط بنام منشی شیونراین آرام (آرام نے چاہا تھا کہ

"مہر نیمروز" دوبارہ چھاپی جائے اور غلطی سے اس کا نام "ماہِ نیم ماہ" لکھ دیا تھا) مرزا اس خط میں لکھتے ہیں "مہر نیم ماہ" نہیں اس کا نام "مہر نیمروز" ہے اور وہ سلاطین تیموریہ کی تواریخ ہے۔ اب نہ چھپانے کے لائق ہے، نہ چھپوانے کے قابل۔"

اُوپر بیان کیے گئے حالات سے جو مختصر نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ پہلے شاہ ظفر نے تاریخ تیموریہ کو امیر تیمور سے شروع کر کے اپنے عہد تک لکھوانے کا ارادہ کیا تھا۔ پھر اسے بدل کر آغاز آفرینش عالم و ظہور آدم سے شروع کرنے کا حکم دیا۔ اب غالب نے اس ردو بدل کے بعد تاریخ کا خاکہ دو حصوں میں بنایا۔ پوری کتاب کا نام "پرتوستان" رکھا، حصہ اوّل (ابتدائے عالم سے ہمایوں تک) کو "مہر نیمروز" کا نام دیا اور حصہ دوم (اکبر سے ظفر تک) کو "ماہِ نیم ماہ" کا۔ شاید حکیم احسن اللہ خاں نے مئی ۱۸۵۷ء تک کوئی اور مسودہ مرزا کو نہیں پہنچایا۔ اس لیے "ماہِ نیم ماہ" لکھنے کی نوبت نہ آئی۔ مگر "پرتوستان" حصہ اوّل یعنی "مہر نیمروز" ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۴ء، ۱۸۵۵ء) میں ۱۸۵۴ء کے آخر تک بحکم مرزا فخرو ولی عہد شاہ ظفر فخر المطابع سے شائع ہو گئی اور مرزا کی زندگی میں "مہر نیمروز" یہی ایک مرتبہ چھپی۔

مگر میرے کتب خانے کے غالب کلکشن میں "مہر نیمروز" طبع اوّل کے کم از کم چار مطبوعہ نسخے (نمبر ۱، نمبر ۲، نمبر ۳، نمبر ۴) ہیں جو بہ ظاہر ہر لحاظ سے طبع اوّل کہے جانے کے مستحق ہیں مگر ان میں کچھ صفحات ایسے ہیں جن کا ایک ساتھ ایک مطبوعہ ایڈیشن میں چھپنا، کسی طرح ممکن نہیں۔ تاہم ان نسخوں کا کم و بیش تین چوتھائی حصہ وہی ہے جو ایک ہی ایڈیشن کا ہے اور سب میں مشترک ہے۔ اب اس سلسلے میں سب سے بڑی مشکل یہ پیش آسکتی تھی کہ فرق دکھانے کے لیے اساسی نسخہ کسے مانا جائے لیکن خوش قسمتی سے مطبوعہ نسخہ نمبر ۱ میرے یہاں موجود ہے۔ یہ وہی نسخہ ہے جو غالب نے اپنے قلم سے تصحیح کر کے والیٔ ٹونک کی خدمت میں طالع یار خاں کے ذریعے بھیجا تھا جو ۲ جمادی الثانی ۱۲۷۱ھ (۱۷ مارچ ۱۸۵۵ء) کو والیٔ ٹونک کے کتب خانہ میں داخل کیا گیا تھا، چوں کہ طبع اوّل کا اب تک کا دریافت شدہ اس سے زیادہ مستند کوئی دوسرا نسخہ میرے علم میں نہیں ہے، لہٰذا باقی نسخوں کا مقابلہ اسی نسخے سے کیا جائے گا۔

نسخۂ اول: اس کی ترتیب اس طرح ہے۔

سرورق	ص ۱
آغاز متن	ص ۲
خاتمہ بالخیر	ص ۱۱۳
صحیح نامہ	ص ۱۱۴
نظم (قطعۂ تاریخ نیر درخشاں)	ص ۱۱۵ و ۱۱۶

یہ اب تک کا دریافت شدہ مستند ترین نسخہ کہا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ اسے غالب نے خاص طور پر مزین و مجلا کرا کے اور بہت سی جگہ پر اپنے قلم سے اصلاحیں کر کے اور حاشیوں میں اضافہ کر کے نواب وزیر الدولہ والی ٹونک کو نذر کیا تھا۔ نسخے کے آخر میں ٹونک راج کے لائبریرین نے لکھا ہے:

"ایں کتاب تاریخ "مہر نیمروز" بتاریخ بست و ہفتم جمادی الثانی ۱۲۷۱ھ معرفت طالع یار خان صاحب فرستادۂ غالب در کتب خانہ حضور بطور نذر داخل شد۔"

نسخۂ دوم: یہ نسخہ ص ۱۱۰ تک قطعی نسخہ نمبر ۱ کے مطابق ہے ص ۱۱۱ سے نسخہ نمبر ۱ کا، ص ۱۱۱ تا ص ۱۱۳ تک، یعنی تین صفحوں کا مواد نسخہ نمبر ۲ میں دو صفحوں ص ۱۱۱ اور ص ۱۱۲ ہی میں سمیٹ لیا گیا ہے۔ گویا نمبر ۱ میں خاتمہ بالخیر ص ۱۱۳ پر ہے اور نسخہ نمبر ۲ ص میں ۱۱۲ پر۔ نسخہ نمبر ۲ کا ص ۱۱۳ خالی ہے اور ص ۱۱۴ کا صحیح نامہ بعینہ وہی ہے جو نسخہ نمبر ۱ کے ص ۱۱۴ کا ہے۔ ص ۱۱۵ اور ص ۱۱۶، یعنی نیر درخشاں کی نظم تاریخ یا حذف کر دی گئی ہے یا پھٹ چکی ہے۔ مگر پھٹے ہوئے ورق کے کوئی آثار باقی نہیں۔

نسخۂ سوم: یہ نسخہ مطابق نسخہ نمبر ۲ کے ہے۔ فرق یہ ہے کہ صحیح نامہ کا ایک ورق جس کا ص ۱۱۴ نسخہ نمبر ۱ اور نسخہ نمبر ۲ کے عین مطابق ہے کتاب کے آخر کے بجائے آغاز کتاب یعنی سرورق سے پہلے لگایا گیا ہے اور اس کا دوسرا صفحہ خالی ہے۔ نسخہ کی قدامت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مہر کے مطابق جو ص نمبر ۲ پر ثبت ہے یہ نسخہ ۱۲۶۵ فصلی میں کسی سید محمد سعید صاحب کی ملک تھا۔

نسخۂ چہارم: اس نسخے کے سرورق کی عبارتیں وہی ہیں جو صفحہ نمبر ۱ کی ہیں مگر نقش و نگار میں فرق ہے۔ شیخ خدا بخش مصور کی جگہ "خدا بخش" مرقوم ہے۔ حروف کی نوک پلک میں نمایاں فرق ہے۔ پہلے تین نسخوں کے ص ۲ پر اُوپر کے آدھے حصے میں بیل بوٹے ہیں مگر اس نسخے میں اس صفحے پر بیل بوٹے ہیں ہی نہیں۔ پہلے ۱۶ صفحے تک تقریباً ہر صفحہ پر لفظوں کی بناوٹ میں کہیں نہ کہیں کچھ فرق ہے، اگرچہ الفاظ، سطریں وغیرہ نسخہ نمبر ۱ کے عین مطابق ہیں۔ پھر ص ۱۷ سے ص ۱۱۰ تک یہ سو فی صد نسخہ نمبر ۱ کے اوراق ہیں مگر اس کے بعد ص ۱۱۱ تا ص ۱۱۳ نسخہ نمبر ۱ کے مطابق بھی ہے اور ص ۱۱۱ تا ص ۱۱۲ نسخہ نمبر ۲ اور نسخہ نمبر ۳ کے مطابق بھی مجلد ہیں۔ پھر ص ۱۱۶ تک سر مو نسخہ نمبر ۱ کے مطابق ہے گویا اس نسخے میں "مہر نیمروز" کے طبع اوّل کی تین مطبوعہ روایتیں موجود ہیں اور چوتھی روایت خود یہ نسخہ ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ کیا پرتوستاں (حصہ اوّل) موسوم بہ مہر نیمروز پہلے ہی سال میں چار بار چھپی تھی؟

استدراک

(الف) مہر نیمروز کے خوب صورت مصور سرورق کے اُوپری حصے پر مہر دفتر خاص ولی عہد بہادر ۱۲۶۸ء، مطبوعہ ہے۔ ۱۲۶۸ھ مطابق ہے۔ ۲۷ اکتوبر ۱۸۵۱ء تا ۱۴ اکتوبر ۱۸۵۲ء کے۔ معلوم نہیں ۱۲۶۸ھ کی کیا خصوصیت ہے۔ جب غالب خاندانِ تیموری کی تاریخ لکھنے پر مقرر ہوئے تو وہ سال (۲۳ شعبان ۱۲۶۶ھ (۴ جولائی ۱۸۵۰ء) تھا۔ جمادی الثانی ۱۲۶۷ھ (مارچ ۱۸۵۱ء) تک ہمایوں کی جلاوطنی اور واپسی تک کا بیان لکھا جاچکا تھا۔

جمادی الاوّل ۱۲۶۸ھ (مارچ ۱۸۵۲ء) تک کام رُکا رہا۔ جمادی الاوّل تا شعبان ورمضان ۱۲۶۸ھ (مارچ ۱۸۵۲ء تا جون ۱۸۵۲ء) میں یہ ردوبدل ہوا کہ اب تاریخ ابتدائے آفرینش عالم و آدم سے شروع ہو۔ غالباً اسی مقام سے ولی عہد بہادر مرزا فخرو نے اس میں براہ راست دلچسپی لینی شروع کی ہوگی اور اس لیے ۱۲۶۸ھ کی مہر چھاپی گئی۔

(ب) نیر درخشاں نے کتاب کی طباعت کی تاریخ اس شعر میں لکھی ہے:

گراں بر رفت در فخر المطابع
ربیع دومیں را روز سابع

یعنی ۷ ربیع الثانی ۱۲۷۱ھ (مطابق ۲۸ دسمبر ۱۸۵۴ء) کو فخر المطابع سے چھپی۔

(ج) نسخہ نمبر ۱ جو غالب نے نواب وزیر الدولہ والی ٹونک کو نذر کیا تھا۔ وہ ۲۷ جمادی الثانی ۱۲۷۱ھ کو نواب صاحب کے کتب خانے میں داخل ہوا۔ یہ ہجری تاریخ ۱۷ مارچ ۱۸۵۵ء کے مطابق ہے۔ گویا یہ نسخہ چھپنے کے دو مہینے ۲۰ روز بعد کتب خانہ ٹونک راج میں داخل کیا جا چکا تھا۔ بطور خاص جلد بندی، اس توجہ سے تصحیح کہ ضمہ، تشدید اور مد تک کے اضافے لفظوں، مرکزوں، حرفوں اور لفظوں تک میں کمی بیشی۔ قلم اور چاقو کی نوک سے تراش خراش، سو سے زیادہ جگہوں پر اور یہ سب غالب کے اپنے ہاتھ سے، پھر ذرائع آمد و رفت کی کمی اور دور و دراز مقامات۔
نشر و اشاعت کا فن کوئی غالب سے سیکھے۔

حواشی

(۱) نادرات غالب۔ مطبوعہ کراچی ۱۹۳۹ء، ص ۹۳ (مکتوبات)
(۲) تفصیل کے لیے دیکھیے ذکر غالب پانچواں ایڈیشن ص ۱۳۵ تا ۱۳۸

دعاے صباح

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن فرماتے ہیں!:

"دعائ الصباح" حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منسوب عربی زبان میں ایک دعا ہے۔ "مثنوی دعای صباح" اسی دعا کا منظوم فارسی ترجمہ ہے۔ غالب نے یہ ترجمہ اپنے بھانجے مرزا عباس بیگ کی فرمائش پر کیا تھا۔ غالب کے خطوں یا ان کی دوسری تحریروں میں اس ترجمے کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ غالب کے تلامذہ اور معاصرین کی تحریریں بھی اس سلسلے میں خاموش ہیں۔

"آبِ حیات" (۱۸۸۰ء) اور یہاں تک کہ "یادگارِ غالب" (۱۸۹۷ء) بھی، اس منظوم ترجمے کے ذکر سے خالی ہے۔ خوش قسمتی سے مولانا امتیاز علی عرشی کو اس مثنوی کا ایک قلمی نسخہ کتاب خانۂ رامپور کے ایک مجموعے میں دستیاب ہوا اور انھوں نے اہل علم سے اس کا تعارف کرایا.......... قلمی نسخے کے ترقیمے کی عبارت یہ ہے:

"دعاء ماثور و منقول از جناب امیر علیہ السلام معہ ترجمہ نثر و نیز ترجمہ منظوم مرزا اسد اللہ خاں غالب موسوم بہ دعائے صباح حسب الایمائے مرزا عباس بیگ صاحب ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لکھنؤ بمطبع منشی نولکشور رونقِ طبع یافتہ...... بود بست و سوم شہر رجب سنہ یک ہزار و دو صد و ہشتاد و چہار، بندہ حقیر فقیر محمد علی بن سید برخوردار علی امروہوی نقل

برداشت "(نگار، لکھنؤ، مئی ۱۹۴۱ء، صفحہ ۱۰)

۲۳ رجب ۱۲۸۳ھ مطابق ہے ۲۰ نومبر ۱۸۶۶ء کے...... ۱۹۵۰ء میں فضل اللہ فاروقی نے اس مثنوی کا مطبوعہ نسخہ ۲ بھی ڈھونڈ نکالا،

اُنھوں نے نوائے ادب، بمبئی، جلد۱، نمبر۲، شمارہ اپریل ۱۹۵۰ء میں "غالب کی مثنوی دعاے صباح کا مطبوعہ نسخہ" کے عنوان سے (صفحہ ۵۶۔۶۱) اس مثنوی کی اوّلین طباعت کا تعارف کرایا...... اس مثنوی کی تعداد اشعار اختلافی ہے۔ فضل اللہ فاروقی لکھتے ہیں کہ:

"مثنوی میں کل ۱۲۴ اشعار دعاے صباح کے ہیں اور ۷ اشعار امام زین العابدین کی مناجات کے ہیں۔ نسخۂ منقولہ (عرشی) میں اشعار کی ترتیب وہی ہے جو مطبوعہ نسخے (کشوری) میں ہے۔"......

مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی (مغل پورہ، لاہور) کے ذخیرۂ غالبیات میں مثنوی "دعای صباح" طبعِ اوّل (نولکشور) کا ایک نسخہ موجود ہے۔ مولانا فاضل نے اس مثنوی کو اپنی مرتبہ "کلیاتِ غالب فارسی" میں شامل کرلیا ہے۔ اس میں مثنوی کے اشعار کی تعداد ۱۲۰ ہے۔ سات اشعار علاوہ ہیں۔ "کلیات" (مذکورہ) میں ان سات اشعار کے عنوان کی عبارت یہ ہے۔ "ترجمہ دعای امام زین العابدین جو حضرت بعد اس دعا کے پڑھتے تھے۔"...... مثنوی "دعای صباح" طبعِ اوّل کا ایک نسخہ کالی داس گپتا رضا (بمبئی) کے غالب کلکشن میں محفوظ ہے جنھوں نے اسے صفحہ بہ صفحہ فوٹو عکس کے ساتھ شائع کردیا ہے۔ اس طرح یہ نادر و نایاب اشاعت اب گویا غالب شناس کی دسترس میں ہے۔

ضخامت: ۲۶ صفحات، سائز: ۲۰×۳۰/۱۶

تعداد اشعار: ۱۲۴+۷

سرورق کی پشت صفحہ ۲ کے دائیں اور ذیلی حاشیے پر فارسی نثر میں اس

دعا کی فضیلت اور حضرت علی سے اس کی نسبت کی سند درج ہے۔
صفحہ ۲ ہی سے "دعاالصباح" کے نسبتاً جلی عنوان کے تحت
"بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے بعد متن شروع ہو جاتا ہے۔
پہلے نسبتاً جلی قلم سے عربی متن، اس کے نیچے فارسی نثر میں ترجمہ اور پھر منظوم فارسی ترجمہ۔ اس ترتیب سے صفحہ ۲ پر تین شعر آئے ہیں اور صفحہ ۳ پر پانچ شعر۔ صفحہ ۳ کے بائیں حاشیے پر "ھذا لاعتصام یقرا سبع مرات" کے عنوان سے عربی میں ایک دعا ہے جسے "دعاء الصباح" سے پہلے پڑھنا چاہیے۔ صفحہ ۲۴ ہی کی آخری دو سطروں میں جلی قلم سے یہ اردو عبارت ہے:
"اور جناب امام زین العابدین علیہ الصلوٰۃ والسلام سے روایت ہے کہ بعد پڑھنے اس دعا کے سجدے میں یہ دعا پڑھے۔" صفحہ ۲۵ سے حضرت امام زین العابدین سے منقول ایک عربی دعا، فارسی نثر اور نظم میں ترجمے کے ساتھ شروع ہو کر صفحہ ۲۶ کے نصف اوّل پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس ہفت شعری دعا کا آخری شعر یہ ہے:

اے خدا از آسماں آور فرود
بر نبی و آل اطہارش درود"

جیسا کہ اُوپر بتایا جا چکا ہے اگرچہ فضل اللہ فاروقی نے ۱۹۵۰ء میں دعائے صباح کے منظوم ترجمے کی اوّلین اشاعت کا تعارف کرا دیا تھا۔ تاہم قیاس چاہتا ہے کہ مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی کی نظروں سے اوّلین اشاعت کبھی نہیں گزری ان کا یہ دعویٰ قطعاً غلط ہے کہ مثنوی دعائے صباح طبعِ اوّل نولکشور کا ایک نسخہ ان کے ذخیرۂ غالبیات میں موجود ۳ ہے۔ جب کہ اشاعتِ اوّل، میں نے ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ ۱۹۷۷ء میں شائع کر کے عام کر دی ہے تو اب کوئی بھی اس مثنوی کا اور جناب فاضل کی شائع کردہ مثنوی، مشمولہ کلیاتِ غالب فارسی، کا مقابلہ کر کے دیکھ سکتا ہے کہ دونوں متنوں میں زمین آسمان کا فرق ہے حتیٰ کہ اصل مثنوی کے کل شعر (۱۲۴ + ۷) ۱۳۱ ہیں اور فاضل صاحب کی مثنوی کے کل

اشعار (۱۲۰+۷) ۱۲۷ ہیں۔ اس کے علاوہ شعروں میں بھی بہت فرق ہے۔ اس طرح اب بھی میرے کتب خانے کا نسخہ طبع اوّل کا واحد نسخہ ہے جو آج تک دستیاب ہو سکا ہے۔
مثنوی کی خامیوں اور خوبیوں اور ترجمے کے حسن وقبح کی بحث کے لیے التماس ہے کہ میرا شائع کردہ نسخہ مع مقدمہ پڑھا جائے۔

حواشی

(۱) غالب کا علمی سرمایہ از: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، یونی ورسل بکس، لاہور۔ فروری ۱۹۸۹ء۔ ص ۲۳۶ تا ۲۴۴
(۲) یہ حقیقت میں میرے ہی کتب خانے والا نسخہ ہے، جسے میں نے دسمبر ۱۹۷۷ء میں مبسوط مقدمے کے ساتھ وِنل پبلی کیشنز۔ بمبئی سے شائع کیا تھا۔ (رضا)
(۳) اورینٹل کالج میگزین لاہور، فروری ۱۹۵۲ء ، ص ۵۴ تا ۶۱ اور کلیاتِ غالب فارسی جلد اوّل مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی مطبوعہ جون ۱۹۶۷ء ، لاہور۔ ص ۳۱۹ تا ۳۳۰۔

انجمن کی تازہ مطبوعات

نام کتاب	مصنف	قیمت
۱۔ اردو ادب کی تحریکیں (چوتھا ایڈیشن)	ڈاکٹر انور سدید	200/-
۲۔ آزادی کے بعد اردو ناول	ڈاکٹر ممتاز احمد خاں	150/-
۳۔ حرفے چند (جلد سوم)	جمیل الدین عالی	100/-
۴۔ سرسید احمد خاں، حالات و افکار	بابائے اردو مولوی عبدالحق	75/-
۵۔ شعریات شوق	رشید حسن خاں	200/-
۶۔ افکار عالیہ	خان رشید / قاضی قیصر الاسلام	130/-
۷۔ شاہد احمد دہلوی حالات و آثار	ڈاکٹر سید محمد عارف	200/-
۸۔ اردو کی ادبی تاریخیں	ڈاکٹر گیان چند	450/-
۹۔ میرے زمانے کی دلی	ملا واحدی	175/-
۱۰۔ ملت اسلامیہ	علی نواز میمن / صفوت قدوائی	250/-
۱۱۔ غالب کے چند پہلو	شمس الرحمٰن فاروقی	100/-
۱۲۔ پاکستان ایک اشرافی ریاست کی معیشت	ڈاکٹر عشرت حسین	480/-
۱۳۔ انجمن ترقی اردو کا المیہ	بابائے اردو مولوی عبدالحق	75/-
۱۴۔ مختصر دنیا	نورالحسن جعفری	150/-
۱۵۔ اردو کی منظوم داستانیں	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	350/-
۱۶۔ جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری	ڈاکٹر ناہید قاسمی	400/-
۱۷۔ مقالات مرزا محمد سعید	شیما مجید	125/-
۱۸۔ تاریخ انجمن بابائے اردو کے بعد	شہزاد منظر / احمد ادیب سہیل	175/-
۱۹۔ اشاریۂ اردو	مصباح العثمان	100/-

انجمن ترقی اردو پاکستان
ڈی-۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی۔